Regd. L. No. 7243 Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1982

اس پرچہ میں :-

قرآن نے علوم سائنس کو
کسقدر اہمیت دی ہے۔

(اس کے خلاف سازش)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ٹیلی فون
۸۸۰۸۰۰

خط وکتابت
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور ۱۱

قیمت فی پرچہ		بدلِ اشتراک
۳ تین روپے		سالانہ پاکستان -/۳۶ روپے غیر ممالک -/۸۶ "

شمارہ ۸	اگست ۱۹۸۲ء	جلد ۳۵

فہرست

۱۔ لمعات ---- (عوام کی مشکلات کا حل کیا ہے؟) ---------- ۲
۲۔ مقامِ انسانیت ---- (محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ) ---------- ۵
۳۔ حقائق وعبر ---- (۱) کیا پاکستانی پرچم و ترانہ کا احترام شرک ہے؟ ---------- ۹
---- (۲) فرقے کیسے بنتے ہیں؟ ---- (۳) مذہب سے عدم دلچسپی ----------
---- (۴) کوڑوں کی سزا (یہاں اور وہاں) (۵) صدرِ مملکت کے انٹرویو کے اقتباسات ----
۴۔ قومیں کیوں تباہ ہوتی ہیں؟ ---- (محترم پرویز صاحب) ---------- ۱۷
۵۔ قرآنی درس کے اعلانات ---------- ۴۰
۶۔ قرآن اور سائنس ---- (خصوصی خطاب محترم پرویز صاحب) ---------- ۴۱
---- (بسلسلہ تقریبِ سعید جشنِ نزولِ قرآن) ----------
۷۔ طلوعِ اسلام کا مسلک و مقصد ---------- ۶۲

ایڈیٹر: محمد خلیل۔ ناشر: شیخ عبدالحمید۔ مقامِ اشاعت: ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ: اشرف پرنٹنگ پریس ۹ رایبٹ روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

یوں تو وہ کونسا دور ہے جس میں عوام کو مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا، لیکن آج کل ان کی کثرت اور شدت بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ آپ کسی شخص سے ملیئے۔ کہیں ملیئے اور کسی وقت ملیئے، اس کے لبوں پر سب سے پہلے حرفِ شکایت آئے گا۔ شکایت بھی ملک اور قوم کے استحکام یا مستقبل سے متعلق نہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں قدم قدم پر پیش آنے والے معاملات سے متعلق ـــــ اور ان کا حل نہ کہنے والے کے پاس ہوگا، نہ سننے والے کے پاس۔ دونوں اس باب میں بے بس نظر آئیں گے۔ یہ حالت سارے کے سارے معاشرہ کی ہو چکی ہے۔ اخبارات نے "شکایات سیل" کھول رکھے ہیں جن کے صفحات شکایات سے بھرے نظر آئینگے لیکن ان مشکلات کا حل کہیں دکھائی نہیں دے گا۔ اس کا اصولی حل، حضرت عمرؓ نے عملاً پیش فرمایا تھا۔ واقعہ تو وہ انہی کے دور کا ہے لیکن جو مثال آپ نے قائم کی تھی وہ ہر دور میں ابدی اصول کا کام دیتی ہے۔ ہوا یوں کہ ملک میں قحط پڑ گیا اور ارد گرد کی ساری آبادیاں ہجوم کر کے مدینہ آگئیں ـــــ اس مشکل کے حل کے لئے آپ نے ایک تدبیر یہ اختیار کی کہ حکم دیدیا کہ مدینہ میں کسی کے گھر میں انفرادی طور پر کچھ نہیں پکے گا۔ ساری غذا یکجا کر لی جائے گی جسے اہلِ مدینہ اور بیرونی پناہ گزین ایک دسترخوان پر مل کر کھائیں گے۔ اس کی ابتدا آپ نے خود اپنے گھر سے کی۔ یہ غذا جس قسم کی ہو سکتی تھی ظاہر ہے۔ آپ اس کے عادی نہیں تھے ـــــ مسلسل پریشانی، پیہم مشقت، دن رات کی تگ و تاز اس پر ناموافق غذا۔ نتیجہ یہ کہ آپ کے چہرے کا رنگ سیاہ پڑ گیا اور دن بدن لاغر ہوتے چلے گئے۔ اس پر آپ کے رفقاء کو تشویش لاحق ہوئی اور انہوں نے آپ سے کہا کہ آپ اس تبدیلیٔ غذا کو برداشت نہیں کر سکیں گے اس لئے آپ اپنے معمول کی غذا کی طرف پلٹ آیئے۔ اس کے جواب میں آپ نے جو کچھ فرمایا وہ 'ابدی اصول' ہے جس میں عوام کی مشکلات کا حل پوشیدہ ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

مجھے لوگوں کی تکالیف کا احساس کس طرح ہو سکتا ہے جب تک مجھ پر بھی وہی کچھ نہ گذرے جو ان پر گذرتی ہے۔ (شاہکارِ رسالت۔ ص ۲۵۷)

آئیے اب چند ایک (سب کی سب نہیں۔ صرف چند ایک) ایسی مشکلات کا جائزہ لیں جن کا سامنا ایک عام شہری کو ہر روز کرنا پڑتا ہے۔

(۱) بجلی اور پانی کا کنکشن لینے کے لئے آپ کو جن صبر آزما مراحل سے گذرنا پڑتا ہے، ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ وقت۔ توانائی۔ پیسہ کے ضیاع کے علاوہ، آپ کے اعصاب پر جو اثر پڑتا ہے وہ ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ لیکن اربابِ اقتدار کو ان مشکلات کا احساس نہیں ہو سکتا کیونکہ انہیں کبھی یہ کنکشن لینے ہی نہیں پڑتے۔ یہ سب ان کے ہاں موجود ہوتے ہیں۔

(۲) کنکشن مل جانے کے بعد، اس شدت کی گرمی کے زمانے میں جس طرح بار بار بجلی فیل ہو جاتی ... اور اس کے ساتھ ہی پانی کی سپلائی منقطع ہو جاتی ہے، اربابِ اقتدار کو اس کا تجربہ ہی نہیں ہوتا۔ ان کے ہاں بجلی فیل ہی نہیں ہوتی۔ نہ پانی کی سپلائی منقطع ہوتی ہے۔ بجلی کی خرابی دور کرانے کے لئے آپ کو جس قدر ٹکریں مارنی اور ذلیل ہونا پڑتا ہے اس کا اندازہ اربابِ اقتدار لگا نہیں سکتے۔ ان کے ہاں کی بجلی میں خرابی نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی ہے تو اسے ٹھیک کرنے والا عملہ وہیں موجود ہوتا ہے۔

(۳) ٹیلی فون کی حالت اس سے بھی ناگفتہ بہ ہے۔ کنکشن لینے کو تو چھوڑیئے۔ کال کرنے یا لینے کے لئے آپ کو جن اعصاب شکن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ بھی اربابِ اقتدار نہیں لگا سکتے۔ ان کے ٹیلیفون خراب ہوتے ہی نہیں۔ اگر کبھی ایسا ہو جائے تو تہلکہ مچ جاتا ہے۔

(۴) حکومت کے خزانہ یا بنک سے کچھ لینے کے لئے نہیں۔ وہاں حکومت کے واجبات جمع کرانے کے لئے آپ کو جس قسم کی دھکم پیل کا مقابلہ کرنا یا اس گرمی کے موسم (اور اکثر دھوپ میں) کھڑے کھڑے صبح کو شام کرنا پڑتا ہے، اربابِ اقتدار کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ انہیں ان امور کے لئے وہاں خود جانا ہی نہیں پڑتا۔ اپنے واجبات لینے کے لئے آپ کو جس قدر چکر کاٹنے اور ذلیل ہونا پڑتا ہے، اس کا ذکر ہم نے عمداً نہیں کیا۔

(۵) کسی زمانے کا محاورہ تھا ــــ السفر سقر ــــ سفر کرنا جہنم کا عذاب بھگتنا ہے۔ جس زمانے میں یہ محاورہ وجود میں آیا تھا، اس سے مراد سفر کی طبیعی تکالیف ہوں گی۔ لیکن آج کا سفر، ہوائی جہاز کا ہو، ریل کا یا بس کا طبیعی تکالیف کے علاوہ جس قدر ذہنی کوفت اور قلبی صعوبت اٹھانی پڑتی ہے اس کی شکایت اس لئے نہیں کی جاتی کہ وہ اب معاشرہ کا معمول بن چکی ہیں۔ اربابِ اقتدار کو اس کا علم و احساس کس طرح ہو سکتا ہے کہ مسافروں پر کیا گذرتی ہے کیونکہ ان کے ساتھ تو کبھی ایسا ہوتا ہی نہیں۔

(۶) رشوت کے متعلق صدرِ مملکت نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اس کا بھاؤ اب بہت چڑھ گیا ہے۔ پہلے جو کام پچاس روپے میں ہو جاتا تھا اب پانچ سو روپے میں بھی نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ صدرِ مملکت نے یہ بات کسی سے سنی ہوگی۔ ان کی آپ بیتی نہیں ہوگی۔ انہیں کون بتائے کہ بات پچاس اور پانسو کی نہیں جس جس قسم کے طبیعی، ذہنی۔ اعصابی تشدد اور عیارانہ طریقوں سے مجبور کر کے رشوت بٹوری جاتی ہے اسے وہی جان سکتا ہے جس پر یہ بیتے!

(۷) چوری، ڈکیتی، قتل و غارتگری اور اغوا کی دہشت انگیزیوں سے حالت یہ ہو چکی ہے کہ کوئی امن پسند شہری رات کو اطمینان کی نیند سو نہیں سکتا۔ لیکن اربابِ اقتدار کو اس کا احساس نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ ان کے ہاں

حفاظت کے اطمینان بخش انتظامات موجود ہوتے ہیں۔

(۸) بچے کو کسی موزوں سکول کی ابتدائی کلاس میں داخل کرانے کے لئے جس قدر جوتے اور دانت گھسنے پڑتے ہیں، ان کی بھنک تک بھی اربابِ اقتدار کے کانوں میں نہیں پڑ سکتی۔ اس پر اخراجات کی بھرمار کہ الٰہی توبہ! محض رجسٹر میں نام درج کرانے کے (مثلاً) ایک سو روپے۔ آپ کی قسمت نے یاوری کی، اور بچے کے داخلے کی باری آ گئی تو داخلے کے تین تین سو روپے۔ اور ابتدائی کلاس (کے جی۔ نرسری وغیرہ کے لئے، جہاں بچے محض کھیلنے کے لئے جاتے ہیں) کی فیس دو دو سو روپے ——— فتوحاتِ بالائی" اس کے علاوہ پڑھانا بچے کو گھر ہی میں پڑتا ہے۔

امتحانات کے کمروں میں جو دھاندلی، دہشت گردی اور فریب کاری ہوتی ہے اس کی موجودگی میں، کوئی طالب العلم اپنے (MERITS) کی بنا پر پاس تو شاید ہو جائے، اس کے لئے پوزیشن حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔۔۔ امتحان پاس کر لینے کے بعد، لاقانونیت کے ذرائع اختیار کئے بغیر ملازمت حاصل کر لینا کسی خوش قسمت ہی کے لئے ممکن ہوگا۔ اربابِ اقتدار کو عوام کی ان مشکلات کا احساس کس طرح ہو سکتا ہے۔ ان کے بچوں کے حصولِ تعلیم و ملازمت کے انداز مختلف ہوتے ہیں۔

(۹) وہ بنیاد جس پر انسان ہی نہیں، حیوانات تک کی زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے" روٹی کا مسئلہ" ہے۔ اس کے حل کے لئے عوام کو جس جانکاہ، جگر گداز، ہمت شکن اور صبر آزما مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اس کا احساس اربابِ اقتدار کو ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمارے ہاں "دال روٹی" غریب ترین معیارِ زیست سمجھا جاتا تھا۔ جہاں دال قریب دس روپے کلو، اور آٹا قریب دو روپے کلو ہو، کس کی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ بال بچے دار (مزدور ہی نہیں) عام سفید پوش، گذارہ کس طرح کرتا ہے؟ پھر جس چیز کا جی چاہتا ہے، مارکیٹ سے ناپید ہو جاتی ہے۔ ملتی بھی ہے تو معلوم اس میں کس کس قسم کی "بدبلا" کی آمیزش ہوتی ہے۔ گوالہ دودھ ملا پانی لاتا ہے اور نرخ بڑھائے چلا جاتا ہے۔ قصاب پچیس چھبیس روپے کلو کے حساب سے گوشت کے نام سے جو کچھ گاہک کی طرف پھینک دیتا ہے، کوئی لیبارٹری ہی بتا سکتی ہے کہ وہ، درحقیقت ہوتا کیا ہے؛ مکھن کو فرائی پین میں رکھ کر ذرا آنچ تیز کر دو تو وہ ہوا بن کر اڑ جاتا ہے۔ جو انڈے مرغی کے سمجھ کر خریدے جاتے ہیں، ان پر مرغی بٹھا دو تو معلوم ان میں سے کس کس قسم کے بچے نکلیں؛

سوچئے کہ جن اربابِ اقتدار کے کھانے کے میز پر صبح شام، تازہ بتازہ، خالص، انواع و اقسام کی اشیائے خورد و نوش بافراط موجود ہوں، انہیں کس طرح احساس ہو سکتا ہے کہ عوام زندگی کے دن کیسے پورے کر رہے ہیں؟

تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ می دانی

تپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ بر پا را!

کہا جا سکتا ہے کہ اربابِ اقتدار کو عوام کی ان مشکلات کا علم تو ہوتا ہے! علم ہونے کے باوجود، ان کا تدارک کیوں نہیں ہوتا، یہ جداگانہ موضوع ہے۔ ہم اس وقت اپنے آپ کو اسی نکتہ تک محدود رکھنا چاہتے ہیں جسے حضرت عمرؓ نے پیش فرمایا تھا۔ علم تو انہیں بھی تھا کہ قحط زدگان کو کس قسم کا کھانا مل رہا ہے، لیکن انہوں نے ان کے ساتھ شریکِ دسترخوان ہونا ضروری سمجھا تا کہ انہیں ذاتی تجربہ اور احساس ہو جائے کہ اس سے ان پر گذرتی کیا ہے۔ اسی سے ان کی مشکلات کا تدارک ہو سکتا تھا۔ اور اسی طرح اسلامی نظام وجود میں آ سکتا اور قائم رہ سکتا تھا۔

محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ

مقامِ انسانیّت

تاریخ انسانی سے اس کربناک حقیقت کی شہادت میں ایسی ہزاروں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ اس جنسِ عظیم نے جسے انسان کہتے ہیں بہ حیثیت مرد اپنے ہی جیسے دوسرے انسان یعنی عورت پر ظلم و ستم ڈھانے اور اسے ذلیل و رسوا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اس کے حقوق چھیننے میں کوئی حربہ باقی نہیں چھوڑا۔ اس کو کسی انصاف و التفات کا مستحق نہیں سمجھا۔ سمجھا تو صرف یہ کہ عورت مرد کی ملکیت ہے اور بس۔ اس ذاتی ملکیت کو مرد جس طرح چاہے استعمال میں لائے۔ جیسا چاہے رکھے۔ محکوم و مجبور۔ پھر جب ایک سے جی بھر جائے تو۔ مالکانہ حقوق سے کام لیتے ہوئے اسے ٹوٹی..... جوتی کی طرح پھینک دے اور دوسری لے آئے۔ یہ تھا انسانوں کی دنیا میں انسان عورت کا درجہ، ماضی میں صدیوں تک یہ چلن جاری رہا۔ شاید ظلمت و جاہلیت کے ادوار کی پہچان ہی یہ تھی کہ عورتیں مردوں کے پاؤں تلے پستی رہیں اور زبان سے آہ بھی نہ نکلے۔ مرد، یہ من مانیاں اور ستم رانیاں کرتا رہا تا آنکہ رحمتِ یزدانی سے قرآنِ حکیم کا نزول ہوا اور نوعِ انسان کو انسانیت کی وہ روشنی ملی جس نے تا قیامت اسی کا ساتھ دینا ہے۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ اسی نورِ مبین کے ذریعے رب العالمین کی منشاء کے مطابق خاتم النبیین رحمۃ اللعالمین رسولِ کریمؐ کے مبارک ہاتھوں وہ انقلاب بپا ہوا جس سے انسانوں کے اذہان پر چھائے ہوئے ظلمت کے اندھیرے چھٹ گئے۔ باطل کی زنجیریں کٹ گئیں۔ حق کا بول بالا ہوا اور وہ انسانی معاشرہ قائم ہوا جس میں مرد اور عورت یکساں سطحِ انسانیت پر متمکن ہوئے۔ یہ وہ معاشرہ تھا جس کے افراد قلب و ذہن قرآنِ کریم کے نور سے منور تھے۔ جن کی سیرت و کردار، جن کے اعمال و اطوار، قرآنی اصول و اقدار کے پرتو تھے۔ اس قرآنی معاشرہ میں مرد اور عورت دونوں پر مشتمل انسان اس مقامِ عزت و شرف کا حامل ہوا جو قرآنِ مجید نے اس کے لئے متعین کیا تھا۔ اس پاکیزہ متوازن معاشرے کے مردوں نے عورتوں پر اپنی مصنوعی برتری کے زعمِ باطل کو اپنے دل و دماغ سے نکال کر حق کی رہنمائی میں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ عورتیں ہماری رفیق ہیں۔ ہماری زوج ہیں اور ہم ان کے رفیق اور زوج۔ ہم ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں۔ وہ معمولاتِ زندگی میں اس فرمانِ الٰہی کو پیشِ نظر رکھتے تھے کہ بعض خصوصیات مردوں کو دی گئی ہیں اور بعض عورتوں کو۔ اس طرح ان خصوصیات کی بنا پر کسی شعبے میں مرد کو فضیلت

حاصل ہوتی ہے تو کسی میں عورت کو۔ اور یوں فطرت کا پروگرام ان دونوں کی رفاقت سے پورا ہوتا ہے۔ اور یہ صرف حیاتیاتی (BIOLOGICAL) شعبے ہیں جن میں مرد عورت الگ الگ خصوصیتیں رکھتے ہیں ورنہ جہاں تک انسانی صلاحیتوں کا تعلق ہے وہ دونوں کو یکساں طور پر ملی ہیں اور ان میں کوئی فرق و امتیاز نہیں۔ قرآن حکیم کی تعلیم کے مطابق محسن انسانیت، جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں جو اُمّتِ مسلمہ تیار ہوئی اس میں مومنین و مومنات جس طرح دوش بدوش سفرِ حیات اختیار کئے ہوئے تھے اس کی واضح تصویر ہمیں سورۂ احزاب کی اس آیۂ جلیلہ میں ملتی ہے جو إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ کے الفاظ سے شروع ہوتی ہے اور جو مرد اور عورت کے برابر ہونے کا ایسا مستقل معیار ہے جس کی مثال اور کہیں نہیں مل سکتی۔ یہ وہ مقامِ انسانیت ہے جو خدا تعالےٰ نے اپنی آخری کتاب کے ذریعے مرد اور عورت دونوں کو عطا کیا۔ مومن مرد ہو یا مومن عورت، جس کے بھی صلاحیت بخش اعمال ہوں گے اس کے درجات بلند ہوں گے اور وہ واجب التکریم ہوگا۔

قرآن کریم پر ایمان رکھنے والے افرادِ انسانیہ جب تک اس کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم پر گامزن رہے مرد عورت کی باہمی رفاقت ایک دوسرے کو اپنے جیسا انسان سمجھتے ہوئے قائم رہی۔ دونوں اپنے فرائض اور دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کے پابند رہے۔ دونوں کو مقامِ انسانیت حاصل رہا۔ لیکن مردوں کی اجارہ داری اس مساوات .... کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکی۔ چنانچہ پھر سے مردوں کا وضع کردہ معاشرہ قائم ہوا اور انہوں نے وضعی روایات کے سہارے عورتوں کو اپنی حاکمیت اور برتری کی صلیب پر لٹکا دیا۔ عورتوں کو بھی اپنی جان کی عافیت اسی میں نظر آئی کہ وہ اپنا بلند مقام اپنا منصب اور وقار، سب کچھ بھول کر یہ سمجھ لیں کہ انہیں صرف مردوں کی خاطر پیدا کیا گیا ہے، وہ ان کے مالک ہیں جو چاہیں ان کے ساتھ کریں۔ کیونکہ وہ ان کے مجازی خدا ہیں۔ پھر عورتوں کی زندگی کا منتہیٰ یہ قرار پاگیا کہ وہ کسی طور مرد کی نگاہ میں جاذب بنی رہیں۔ زیادہ سے زیادہ بناؤ سنگھار اور آرائش و زیبائش کرنا اس لئے ضروری ہوگیا کہ ان کے مجازی خداؤں کے دل بہلے رہیں۔ اس طرح عورتیں یا بیویاں محض رنگین کھلونے بن کر رہ گئیں۔ کھلونوں کی جو حیثیت ہوتی ہے اُسے کون نہیں جانتا! عورتوں کو یہ حیثیت دی گئی اور اس کے سوا اُن کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ دورِ جاہلیت پھر لوٹ آیا۔ علم و فکر اور سوچ سمجھ کو بالائے طاق رکھ کر عورت کو مقامِ انسانیت سے گرانے کی زیادہ سے زیادہ حریفانہ کوششیں ہونے لگیں۔ اسلام سے قبل عورت کو سب سے بڑا مجرم اس بات کا ٹھہرایا گیا تھا کہ وہ شیطان کے بہکاوے میں آئی اور اس نے آدم کو پھسلایا اور جنت سے نکلوایا۔ پھر یہ عقیدۂ باطل ساری دنیا میں پھیل کر لوگوں کے ذہنوں کو مسموم کرتا چلا گیا۔ تردید اس کی کون کرتا جبکہ مذہبی پیشوائیت کی مہربانی سے مردوں کو یہ ایک ایسا مضبوط اور مہلک ہتھیار مل گیا تھا جس کے ہوتے مردوں کی عورتوں پر بالادستی قائم و مستحکم تھی اور عورتوں کو اپنے ناکردہ گناہ کی سزا بھگتنا تھی۔ قرآن کریم آیا اور فرمانِ خداوندی نے واضح الفاظ میں یہ اعلان کر دیا کہ

آدم کو جنت سے نکلوانے کی ذمہ دار اس کی بیوی نہ تھی بلکہ ہوا یوں تھا کہ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا..... یعنی آدم اور اس کی بیوی، دونوں شیطان کے بہکاوے میں آگئے تھے اس لئے یہ سمجھنا یکسر غلط ہے کہ عورت گنہگار ہے اور مرد بے قصور اور معصوم۔ دونوں کو یہ لغزش ہوئی۔ یوں اسلام نے عورت کو اس الزامِ باطل سے واضح طور پر بری کیا کہ اس نے مرد کو بہکایا تھا۔ مگر اسلام کے مدعی مردوں نے اس مستعار عقیدے کو بدستور حرزِ جاں اور جزوِ ایمان بنائے رکھا کیونکہ یہی تو وہ بنیاد تھی جس پر مرد کی عورت کے مقابلے میں نام نہاد فضیلت و برتری کی عمارت کھڑی تھی اور کھڑی ہے۔ بظاہر اس روشنی، ترقی اور آزادی کے زمانے میں بھی ہمارے ہاں صورت یہ ہے کہ تقریروں میں، تحریروں میں، عام بات چیت میں، ہر جگہ اس کا ذکر ہوتا ہے اور کوئی دوسرا کسی کی زبان نہیں روکتا۔ دم بھر رک کر یہ نہیں سوچتا کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے اس کے الفاظ کیا ہیں؟ ان الفاظ کی تلاوت بھی ثواب کے لئے ہے۔ قرآنِ کریم کے الفاظ پر سے یونہی گزر جانا ہمارا وطیرہ بن چکا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ عورتیں بھی اس الزام کو اپنا مقدر سمجھ کر مطمئن ہو چکی ہیں۔ اس کے بعد کون پوچھے کہ قرآن کریم کی اس نصِ صریح کے ہوتے ہوئے عورت کو شیطان کا آلۂ کار سمجھنے کا کیا جواز رہ جاتا ہے! احترامِ آدمیت کا جو اصل الاصول قرآن نے ہمیں عطا کیا ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ..... یہ پوری نوعِ انسانی کے لئے ہے۔ اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ چنانچہ دینِ اسلام میں مرد اور عورت کے مقامِ انسانیت میں کوئی فرق نہیں۔ پیدائش کے لحاظ سے دیکھئے تو یہاں بھی مرد عورت کو ایک دوسرے پر کوئی فضیلت یا سبقت حاصل نہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ دونوں کا سرچشمۂ حیات ایک ہے اور دونوں ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں۔ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ۔

قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے انسان اور انسان میں تمیز نہیں کی جا سکتی وہ کسی مزدور کے گھر پیدا ہو یا ٹھیکیدار کے۔ کسی غریب کی کٹیا میں جنم لے یا کسی محل میں آنکھ کھولے، بطور انسان سب برابر ہیں۔ اس اصول کو سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ ایک شخص کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے اور ایک لڑکی۔ اور یہ بات واضح ہے کہ لڑکا اپنی کسی کاریگری سے لڑکا نہیں بن گیا اور نہ ہی لڑکی کا یہ جرم ہے کہ وہ لڑکی پیدا ہوئی۔ پھر اگر اس نظریہ کو صحیح تصور کر لیا جائے کہ لڑکی، لڑکے سے یا عورت مرد سے فروتر ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پیدائش کے اعتبار سے ایک جنس افضل، دوسری کمتر ہے۔ اور ان میں یہ فرق ایسا ہے جسے کمتر فریق یعنی عورت لاکھ کوشش کرنے کے باوجود کسی طور پر بھی مٹا نہیں سکتی۔ سوچئے کہ اس غلط تصور کی رُو سے، کہ مرد کو محض مرد ہونے کی جہت سے عورت پر فضیلت حاصل ہے، کیا اسلام کی بلند ترین تعلیم جڑ بنیاد سے اکھڑ کر نہیں رہ جاتی؟ مگر سوچے کون! سوچنا تو ہم پر حرام ٹھہرا۔ سوچنے اور غور کرنے سے تو حقائق کے پرت کھلتے ہیں اور جھوٹ کے گھروندے ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ پھر سچ سے بھاگنے کی صورت کہاں باقی رہتی ہے!! یہاں تو جائے پناہ اسی میں تھی کہ یہ ڈھنڈورا مسلسل صبح شام پیٹا رہے کہ مرد، عورت پر فوقیت رکھتا ہے۔ مرد کی حاکمیت

کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ عورت مرد کی مرضی کے بغیر کچھ کرنے کی مجاز نہیں وغیرہ وغیرہ۔

اور اس سے بڑھ کر ستم ظریفی اور کیا ہوگی کہ اسی قرآن کی ایک آیت کو حسبِ منشاء معانی پہنا کر مرد کی حاکمیت کا جواز نکالا جائے۔ اور وہ آیت ہے : اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ..... مذہبی پیشوائیت نے قَوّٰمُوْنَ کا مطلب داروغے اور حاکم بنا لیا۔ اس سے حکومت کے اجارہ دار مردوں کی مطلب برآری ہوگئی۔ لیکن حق سے رہنمائی لینے والے غور و فکر کر کے قرآن کو سمجھنے والے جانتے تھے اور جانتے ہیں کہ اس آیت کا اصل مفہوم کیا ہے۔ قدیم اور مستند عربی لغات کی رُو سے قَامَ الرَّجُلُ الْمَرْاَۃَ وَ قَامَ عَلَيْهَا کا مطلب ہے مرد نے عورت کی کفالت کی۔ اس کی ضروریات کو پورا کیا اور ان کا ذمہ دار ہوا۔ قرآن کریم نے تقسیم کار کے اصول کے مطابق مردوں کا فریضہ یہ بتایا کہ وہ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ہیں۔ پس قَوّٰمُوْنَ کا مفہوم متعین ہو جانے کے بعد آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ وہ عورتوں کی ضروریاتِ زندگی کے کفیل ہوں کیونکہ عورتیں اپنے خصوصی فرائض یعنی بچوں کی پیدائش۔ پرورش اور تربیت کی سرانجام دہی کی وجہ سے اکتسابِ رزق کے لئے زیادہ وقت نہیں دے سکتیں۔ اس نکھرے اور اُبھرے ہوئے قرآنی مفہوم کے بعد کسی اعتراض کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟ لیکن مرد کی مردانگی کی پکار یہ تھی اور یہ ہے کہ عورت ہرگز ہرگز اس کی ہم قدم ہم مقام نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے یہ لازم تھا کہ قرآن کی بات سامنے نہ آنے پائے۔ نتیجتاً جو قرآنی لفظ مردوں کو عورتوں کی روزی مہیا کرنے کا ذمہ دار قرار دیتا ہے اسی کو غلط معانی پہنا کر مردوں کو عورتوں پر حاکم بنا دیا!

اللہ تعالیٰ کی کتابِ مبین کی رُو سے زندگی کا کوئی گوشہ اور معاملہ ایسا نہیں جہاں انسانیت اور معاشرت کے تعلق سے اور اخلاق و اقدار کے اعتبار سے عورت کو وہ مقام نہ ملا ہو جو مرد کو ملا ہے۔ بلکہ بعض معاملات میں ایسا بھی ہے کہ مرد کے مقابلے میں عورت کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے، جیسا کہ نکاح کا معاملہ۔ جہاں قرآن نے مرد سے یہ کہا ہے کہ وہ نکاح کرنا چاہتا ہے تو تنہا اپنے آپ کو عورت کے برابر نہ سمجھ لے۔ اسے اپنے ساتھ کوئی تحفہ بھی دے۔ جسے مہر کہتے ہیں۔ قرآن میں کہیں جگہ بھی یہ نہیں آیا کہ نکاح کے وقت عورت جہیز کی صورت میں اپنے ساتھ ڈھیروں سامان لے کر جائے۔ سارے قرآن میں جہیز کا کہیں ذکر تک نہیں آیا۔ البتہ ادائیگیٔ مہر کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ میاں بیوی کی حیثیت میں قانونی نقطۂ نگاہ سے بھی قرآن نے عورت کا مقام واضح کر دیا ہے یہ کہہ کر کہ قاعدے اور قانون کی رُو سے عورتوں کی جتنی ذمہ داریاں ہیں ان کے اتنے ہی حقوق ہیں۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ یہ وہ مکمل، غیر متبدل اور مستقل راہنمائی ہے جو قرآن کریم ہمیں دیتا ہے اور جو قرآن کے الفاظ میں مکتوب و محفوظ ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس رہنمائی سے کسی طور کسی معاملۂ زندگی میں ہمارا کوئی عملی تعلق بھی ہے؟ کیا ہم نے اس کے مطابق زندگی کا راستہ اختیار کر رکھا ہے؟ ہمارا المیہ تو یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم، قرآن کے احکام، سب اپنی جگہ اور ہم حاملینِ قرآن، کی میں نہ مانوں اپنی جگہ۔

(باقی بر صفحہ ۴۳)

حقائق و عبر و مراسلات

۱- پاکستانی پرچم و ترانہ کا احترام

سوال :- میں نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خیالات کو کبھی درخور اعتناء نہیں سمجھا۔ لیکن ایک بات انہوں نے ایسی کہی ہے کہ جس کا اگر ابھی سے نوٹس نہ لیا گیا تو وہ بڑے خطرناک عواقب کا موجب بن سکتی ہے۔ اس سے خود پاکستان کے استحکام کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ پاکستان کی مدافعت اور استحکام کا اوّلاً انحصار فوج پر ہے۔ اور کوئی ایسا نظریہ (حتیٰ کہ اشارہ تک بھی) جو فوج میں وسوسہ انگیزی کا موجب ہو، مملکت کو کمزور کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔ پاکستانی ترانہ اور پرچم (بالخصوص پرچم) کا احترام سپاہی کی زندگی کا جزو ہوتا ہے۔ میدانِ جنگ میں سپاہی کٹ کٹ کر مر جائیں گے لیکن وہ اپنے پرچم پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے کہا ہے کہ قومی ترانہ اور پرچم کا احترام شرک ہے اور "ترانہ کے دوران قیام اور قومی پرچم کو سلام، دراصل معبودِ وطن کی نماز ہے"۔ فوج کے سپاہی بالعموم مذہب پرست اور نا خواندہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے اگر ایک فی صد کے کان میں بھی یہ آواز پڑ گئی کہ ترانہ اور پرچم کا احترام شرک ہے تو سوچیئے کہ اس کے نتائج کس قدر خطرناک ہونگے؟ اگر انہوں نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا تو اس سے فوج میں بغاوت پھیل جائے گی۔ معلوم نہیں یہ کہتے وقت ڈاکٹر صاحب نے ان خطرناک عواقب کا احساس کیا تھا یا نہیں، اگر وہ اپنے خیال کے مطابق اسے شرک سمجھتے اور اس کا ازالہ کرانا چاہتے تھے تو خیر خواہیٔ وطن کا تقاضا یہ تھا کہ وہ فوج کے اربابِ اقتدار تک، ذاتی طور پر یہ بات پہنچاتے اور جب تک وہ کسی فیصلہ تک نہ پہنچتے، اس کی پبلک میں تشہیر نہ کرتے۔ خیر خواہی اور نیک نیتی کا تقاضا تو انسان کو یہاں تک لے جاتا ہے کہ حضرت ہارونؑ نے، اس خیال سے کہ قوم میں تفرقہ نہ پیدا ہو جائے، انہیں گئو سالہ پرستی سے بھی نہیں روکا تھا۔

بہر حال، ڈاکٹر اسرار احمد سے قطع نظر، میں چاہتا ہوں کہ یہ بات صاف ہو جائے کہ پرچم یا ترانہ کا احترام، واقعی شرک ہے؟

طلوعِ اسلام :- ہم بھی سر دست، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو درمیان میں لائے بغیر،

اپنے آپ کو سوال زیرِ نظر کے جواب تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ ہمارے مروّجہ اسالیب و مسالک میں اگر کوئی بھی ایسا ہے جس میں شرک پایا جاتا ہے، تو ہم سب سے پہلے اس کی مخالفت کریں گے۔ جو طلوعِ اسلام کسی انسان کی حکومت کو بھی، از روئے قرآن شرک قرار دیتا ہو، وہ کسی مشرکانہ اسلوب اور مسلک کو کس طرح گوارا کرے گا۔ لیکن پرچم یا ترانہ کا احترام، قرآنِ کریم کی روشنی میں شرک نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ غیر مرئی اور غیر محسوس حقائق (ABSTRACT REALITIES) کو محسوس علامات کی رُو سے سمجھایا جاتا ہے۔ انہیں (SYMBOLS) کہتے ہیں اور اس طریقِ تفہیم کو علاماتی (SYMBOLICAL) خدا نے جب اپنے آپ کو ربّ العرش کہا ہے، تو عرش سے مراد سچ مچ لکڑی کا تخت نہیں۔ یہ علاماتی اندازِ تفہیم ہے۔ عرش علامت ہے اقتدار اور حکومت کی۔

قرآنِ کریم میں علامات کے بجائے لفظ شعائر آیا ہے۔ خدا کی اطاعت، دل کے جھکاؤ کا نام ہے لیکن اس کا مظاہرہ بہرحال محسوس رسوم و ارکان کی شکل میں ہوتا ہے۔ وہ بھی شعائر ہیں، لیکن حج کے سلسلہ میں اس نے بعض چیزوں کو خصوصیت سے شعائر اللہ کہہ کر پکارا ہے (مثلاً) سورۂ بقرہ میں ہے: إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ ۖ ..... (۲/۱۵۸)

صفا اور مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں۔ یہ دو پہاڑیاں ہیں۔ (بلکہ یوں کہئے کہ پہاڑیاں تھیں۔ اب تو وہ نہایت پُرآسائش و زیبائش نشاناتِ راہ رہ گئی ہیں)۔ ان میں سعی کی جاتی ہے۔ سورۃ الحج میں ہے: وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُم مِّن شَعَائِرِ اللَّهِ ..... (۲۲/۳۶)۔ اور (حج کے موقع پر ذبح کئے جانے والے) اونٹ بھی شعائر اللہ میں سے ہیں۔ ظاہر ہے کہ صفا اور مروہ مٹی اور پتھروں کی دو پہاڑیاں تھیں۔ اور اونٹوں کو تو ہم جانتے ہی ہیں کہ وہ اونٹ ہوتے ہیں۔ لیکن جب انہیں کسی بلند مقصد کے حصول کی علامات قرار دے دیا تو حکم دیا کہ ان علامات کی بے حرمتی مت کرو۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ ..... (۵/۲)

اے ایمان والو! شعائر اللہ کی بے حرمتی مت کرو۔ نہ ہی واجب الاحترام مہینہ کی۔ نہ ہی ان تحائف کی جو حج کے موقعہ پر بھیجے جائیں۔ حتّیٰ کہ ان پٹوں اور ہاروں کی بھی بے حرمتی نہ کرو جو ان جانوروں کے گلے میں ڈالے جائیں جنہیں حج کی تقریب پر ذبح کرنے کے لئے لایا جائے۔

غور فرمائیے! کس کس قسم کی چیزوں کو شعائر اللہ قرار دیا گیا ہے اور ان کی بے حرمتی کرنے سے منع کیا گیا۔ یہاں تو ان کی بے حرمتی سے روکا گیا ہے۔ سورۃ الحج میں ان کی تعظیم ..... کرنے کی اہمیت نمایاں کی گئی ہے۔ لیکن اس حقیقت کو اس انداز سے بیان کیا گیا ہے جس سے وہ نکات واضح ہو جاتے

ہیں جو مسئلہ زیرِ نظر سے متعلق ہیں۔ اس میں (پہلی آیت میں) شرک سے بڑی شدت سے روکا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ تذلیلِ انسانیت کی علامت ہے۔ شرک کی اس قدر مذمت کرنے کے بعد کہا: ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝ (۲۲/۳۲) یعنی شعائر اللہ کی تعظیم سے شرک لازم نہیں آتا بلکہ یہ اس امر کی دلیل ہوتی ہے کہ تمہارے دل میں اطاعتِ خداوندی کا جذبہ کس قدر گہرا ہے۔ یہ تقویٰ کی علامت ہوتی ہے۔ اس آیۂ جلیلہ سے دو باتیں واضح ہیں۔ ایک یہ کہ شعائر اللہ کی تعظیم شرک نہیں اور دوسرے یہ کہ شعائر (علامات) مقصود بالذات نہیں۔ مقصود بالذات دلوں کا تقویٰ ہے۔ یہ محسوس علامات صرف اس کی مظہر ہیں۔ اگر علامات مقصود بالذات بن جائیں تو ان کی پرستش ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ مذاہبِ عالم میں ایسا ہی ہوا۔ وہاں علامات بجائے خویش تقدیس کا مرجع اور پرستش کے مراکز بن گئیں۔ ہمارے شعائر میں سرِفہرست، خانہ کعبہ ہے۔ اسے خدا نے خود اپنا گھر کہہ کر پکارا ہے۔ حالانکہ خدا ہر قسم کی زمان اور مکان کی نسبتوں سے بلند اور منزہ ہے۔ اس کا نام ہی مسجد الحرام ہے اس لئے اس کی حرمت میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جس قدر احترام خانہ کعبہ کا ہوتا ہے، دنیا میں شاید ہی کسی اور مقام کا ہوتا ہو۔ لیکن اس کے باوجود آپ دیکھئے کہ اس کی پرستش نہیں ہوتی حالانکہ پرستش کے مظاہر پر آپ نگاہ ڈالیے تو وہ سب سے عظیم مرکز نظر آئیگا۔ وہاں ہزاروں بندگانِ توحید اس کے سامنے اس طرح سجدہ ریز رہتے ہیں کہ ان کے اور خانہ کعبہ کے درمیان کچھ حائل نہیں ہوتا۔ لیکن کسی کے دل میں شائبہ تک نہیں گذرتا کہ ہم کعبہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ سجدہ خدا ہی کے لئے مختص ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے خدا کا بھی بت نہیں بنایا۔ کیونکہ اس نے یہ کہہ کر اس سے روک دیا تھا کہ..... لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ ۝ (۴۲/۱۱) "کوئی شے اس کی مثل نہیں"۔ اس لئے خدا کی کوئی علامت (SYMBOL) بھی اسلام میں راہ نہیں پا سکتی۔

(۰)

اسلام میں (یعنی قرآن کی رو سے) مملکت بھی مقصود بالذات نہیں۔ یہ دین کے تمکن کا ذریعہ ہے (۲۴/۵۵)۔ مملکت کا احترام اس لئے ضروری ہے کہ وہ ایک واجب الاحترام مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس کا احترام جذبوں کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے، اس کے قیام اور استحکام کا موجب قرار پاتا ہے۔ لیکن مملکت (STATE) تو ایک بسیط (ABSTRACT) حقیقت ہے۔ ملوکیت کے دور میں تاج اور تخت اس کے مظاہر تھے۔ اسلام نے ملوکیت کا خاتمہ کیا تو اس کے ساتھ ہی تخت اور تاج بھی خاک میں دفن ہو گئے۔ لیکن (تاریخ بتاتی ہے کہ) عہدِ رسالت مآبؐ میں پرچم کو مملکت کی علامت کے طور پر قائم رکھا گیا۔ اس کی اہمیت اس قدر تھی کہ جس شب حضورؐ فرماتے تھے کہ میں صبح یہ علم کسی جانثار کے ہاتھ میں دوں گا تو صحابہؓ رات بھر جاگ کر کاٹتے تھے کہ دیکھیں یہ سعادت کس کے حصے میں آتی ہے، اسے بلند رکھنے کی اہمیت اس قدر تھی کہ علمبردار کے بازو کٹ جاتے تھے لیکن وہ علم کو سرنگوں نہیں ہونے دیتا تھا۔ ایک غزوہ میں تو خود حضورؐ نے سواری سے اتر کر گرتے ہوئے علم

کو اپنے مقدس ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ اہمیت لکڑی کے ڈنڈے یا کپڑے کے ٹکڑے کی نہیں تھی۔ یہ مملکت کی اہمیت اور احترام کا محسوس مظاہرہ تھا۔ اس کو پرچم کا احترام کہا جاتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ مملکت، نظامِ خداوندی کے تمکّن کا ذریعہ ہے، اور پرچم اس مملکت کے قیام اور استحکام کی علامت۔ اصل احترام تو نظامِ خداوندی کا ہے جو مومنین کا جزوِ ایمان ہے۔ آپ سوچئے کہ اگر اس (عزیزمن) اصل کے احترام کے اظہار کے لئے، اس کے ذرائع اور علامات کا احترام کر لیا جائے تو اس میں کونسا شرک لازم آجائے گا؟ ہمارے ہاں بلکہ ساری دنیا میں) احترام کے اظہار کے لئے ہاتھ اٹھا کر سر کی طرف لے جایا جاتا ہے، ایسے سلام کرنا کہتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم جسے سلام کرتے ہیں اس کی پرستش کرتے ہیں۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی، جبکہ شرک، سنتِ مستطیر کی طرح عام ہو رہا ہے، کوئی سپاہی پرچم کی پرستش نہیں کرتا۔ وہ اپنی یونٹ کو بلند رکھنے کے جذبہ کا اظہار، اپنے پرچم کو بلند کرنے سے کرتا ہے، اور مملکت کے احترام کا اظہار اس کی علامت (پرچم) کو سلامی دے کر۔ ہمارا خیال ہے کہ ہماری تاریخ میں ـــــ جو مختلف اقسام کے شرکوں سے مملو ہے ـــــ یہ خیال اس سے پہلے کسی کے دل میں بھی پیدا نہیں ہوا کہ مملکت کی علامت کا احترام بھی شرک میں داخل ہے۔

یہ ہے ہمارے نزدیک اس احترام اور تعظیم کی حقیقت قرآن کریم کی روشنی میں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے پرچم کو بصراحت شعائر میں شامل نہیں کیا، لیکن اس نے شعائر کی تمام اقسام کو تو نہیں گنایا! اس نے تو بیت اللہ کو بھی بصراحت اس زمرے میں شامل نہیں کیا حالانکہ اس کے منجملہ شعائر اللہ ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ اس نے صرف ایک اصول بیان کیا ہے کہ شعائر کی تعظیم ممنوع نہیں۔ ان کی پرستش البتہ ممنوع ہے۔ اور پرچم اور ترانے کی پرستش کوئی نہیں کرتا۔

(○)

۲۔ فرقے کیسے بنتے ہیں؟

پاکستان کی وفاقی شرعی عدالت نے فیصلہ دیا کہ رجم (سنگساری) کی سزا کتاب و سنت کے خلاف ہے۔ حکومت نے عدالت کی تدوینِ نو کی اور اس سے کہا کہ اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی کرے۔ عدالت نے نظرِ ثانی کے بعد فیصلہ صادر کیا کہ رجم کی سزا کتاب و سنت کے مطابق ہے۔

اس وقت تو یہ عدالتیں مملکتِ پاکستان کے زیرِ قوانین ہیں اس لئے ملک میں دوسرا فیصلہ ہی نافذ ہوگا۔ لیکن بعد کے زمانے میں جب نہ یہ مملکت ہوگی۔ نہ یہ عدالتیں۔ تاریخ کے سامنے دو فیصلے ہوں گے، ایک دوسرے سے متضاد۔ اور دونوں کی بنیاد اس دعویٰ پر ہوگی کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق ہیں۔ ایک گروہ اس "کتاب و سنت" کی پیروی کرے گا جس کی رُو سے رجم کو خلافِ اسلام قرار دیا گیا تھا۔ دوسرا گروہ، دوسرے فیصلے کی۔ دونوں فیصلے فقہ کے مجموعوں میں شامل ہو جائیں گے اور اس طرح دو فقہی فرقے وجود میں آجائیں گے۔ موجودہ فرقوں

کی طرح بھی کچھ اسی طرح پڑی تھی۔ فیصلہ کی بنیاد اگر قرآن خالص کو قرار دے دیا جاتا تو نہ موجودہ عدالتیں دو متضاد فیصلے دیتیں، نہ بعد میں دو فرقوں کے وجود میں آنے کا امکان رہتا۔

(۰)

۳۔ مذہب سے دلچسپی

روزنامہ جنگ (لاہور) بابت ۲۵ جون ۱۹۸۲ء میں یہ خبر چھپی ہے کہ وفاقی شرعی عدالت نے تیرہ قوانین کو اسلام کے مطابق قرار دے دیا ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے:۔

> عدالت نے اسلام آباد میں جاری کئے جانے والے..... پریس ریلیز میں کہا ہے کہ ان قوانین کے بارے میں رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے، ۸ اپریل کو جو درخواست کی گئی تھی کسی مذہبی ادارے، صوبائی بار کونسل، بار ایسوسی ایشن یا عوام کی طرف سے اس کا جواب نہیں دیا گیا۔ اس سے عدالت کو ان قوانین کا خود جائزہ لینا پڑا۔

ہمارے ہاں مذہب کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ مذہب ہی نہیں لوگوں کو زندگی کے کسی شعبے کے ساتھ بھی دلچسپی نہیں رہی۔ قوم کی حالت اصحابِ کہف کی سی ہو رہی ہے۔ جن کے متعلق کہا تھا کہ وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُودٌ ..... (۱۸/۱۸) "تم خیال کرتے ہو کہ وہ جاگتے ہیں۔ وہ جاگتے نہیں سوئے ہوئے ہیں"۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر جہنمی زندگی کہ..... لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ۝ (۲۰/۷۴)۔ "نہ مردہ، نہ زندہ"

(۰)

۴۔ کوڑوں کی سزا

روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۲۴ جون ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں حسب ذیل خبر چھپی ہے:۔

> ابوظہبی میں سری لنکا کی ایک انیس سالہ لڑکی کو ایک شادی شدہ بھارتی باشندے کے ساتھ جنسی تعلقات استوار رکھنے کے جرم میں سو کوڑے لگا دیئے گئے..... ابوظہبی کے حکام نے سری لنکا کی حکومت کو بتایا ہے کہ لڑکی کو کوڑے کھجور کی پتوں والی چھڑی سے مارے گئے اور وہ زخمی نہیں ہوئی۔

ایک "شرعی کوڑے" یہ ہیں، اور ایک وہ ہیں جو ہمارے ہاں لگائے جاتے ہیں:

(۰)

۵۔ صدرِ مملکت کا انٹرویو

صدرِ مملکتِ پاکستان نے (اواخر مئی یا شروع جون میں) بھارت کے جریدہ "سنڈے" کے نمائندہ

(مسٹر ایم۔ جے اکبر) کو ایک طویل انٹرویو دیا تھا۔ نمائندہ کی تصریح کے مطابق، انٹرویو کا مقررہ وقت ۴۵ منٹ تھا لیکن وہ قریب اڑھائی گھنٹہ پر پھیل گیا۔ یہ انٹرویو بعض پاکستانی اخبارات میں پورے کا پورا شائع ہوا ہے اور بعض میں اس کے اقتباسات کے تراجم۔ ہماری عدم گنجائش مانع ہے کہ اسے پورے کا پورا شائع کیا جائے۔ اس لئے ہم اس کے بعض اہم اقتباسات کی اشاعت پر اکتفا کریں گے اور تبصرہ قارئین طلوعِ اسلام کی بصیرت پر چھوڑ دیں گے۔

میں کبھی جھوٹ نہیں بولونگا

(i) **سوال:-** آپ نے کہا ہے کہ میں اس معیارِ اخلاق پر ایمان رکھتا ہوں جس کی تلقین اسلام نے کی ہے۔ لیکن اب تو آپ سیاست میں داخل ہو چکے ہیں، اور جو لوگ سیاست میں آجائیں ان کی شہرت کا ہمیں اچھی طرح علم ہے۔ کیا آپ کے اس نئے مسلک نے آپ کو کبھی جھوٹ بولنے پر مجبور کیا ہے؟

جواب:- کبھی نہیں حتیٰ کہ پاکستان کے مفاد میں بھی نہیں ... میں کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں فرشتہ نہیں لیکن سیاست میں بھی، جہاں سوال آپ کے وقار اور آپ کے ملک کے وقار کا ہو، میں الزام تو اپنے سر دھر لوں گا لیکن جھوٹ نہیں بولونگا۔

تصورِ پاکستان

(ii) سوال سیکولر مملکتوں اور اسلامی مملکتوں سے متعلق تھا۔ صدرِ مملکت نے کہا کہ دیگر اسلامی مملکتیں پیدائشی اور فطری طور پر اسلامی تھیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو تخلیق نہیں کیا تھا۔ لیکن پاکستان کو ہم نے اسلام کے نام سے تخلیق کیا تھا۔ اس کے لئے اقبالؒ نے ۱۹۲۵ء میں اور مسٹر شوکت علی نے ایک جداگانہ مملکت کا تصور پیش کیا۔

(یہاں غالباً مسٹر اکبر کو تسامح ہوگیا ہے، اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں پاکستان کا تصور پیش کیا تھا اور اسے عملی پیکر قائد اعظمؒ محمد علی نے عطا کیا تھا۔ مولانا شوکت علی اس محاذ کے جانباز مجاہد تھے۔)

پہلے بھارتی بعد میں مسلمان!

(iii) ایک سوال کے جواب میں صدرِ مملکت نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان کا مسلمان ایک بھارتی اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنا تشخص قائم کرے۔ میرا سر فخر سے اونچا ہو جائے گا جب میں دیکھوں گا کہ ہندوستانی مسلمان اپنے آپ کو پہلے بھارتی اور بعد میں مسلمان کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ میں یہ سن کر بڑا فخر محسوس کرونگا۔

(iv) سوال:- حکومت کے متعلق مسلمانوں کا طرزِ عمل کیا ہے؟

شخصی حکومت

جواب:- مسلمان فطرۃً ۔۔۔ اور پاکستانی مسلمانوں کے متعلق تو مجھے ذاتی علم ہے کہ وہ شخصی حکومت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ ایک خدا۔ ایک رسولؐ اور ایک کتاب میں ایمان رکھتے ہیں۔ شاید اسی لئے وہ ایک فرد کی حکومت چاہتے ہیں۔

(v) **سوال:-** اس دلیل سے تو یہ مترشح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ ایک حکمران کس طریق سے برسرِ اقتدار آگیا ہے۔

جواب:- بالکل بجا۔ اسلام کے نزدیک اس سوال کو کوئی اہمیت ہی نہیں کہ ایک حکمران نے کس

کس طرح اقتدار حاصل کیا؟

طریق سے اقتدار حاصل کیا ہے اس کے نزدیک اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ وہ کتاب اللہ کا پیرو اور عملاً مسلمان ہے یا نہیں؛ اگر وہ ایسا ہے تو اس کے احکامات کی اطاعت لازمی ہوگی۔ اگر وہ ایسا نہیں تو اسے مسترد کر دیا جائے گا۔ اس باب میں احکامات موجود ہیں کہ اقتدار کے لئے ان لوگوں کو منتخب کرو جو متقی اور پرہیزگار ہوں۔ یہ شرط موجود ہے لیکن اس کے لئے نامزدگی نہیں ہوگی، اگرچہ ہمارے ہاں نامزدگی بھی ہے۔

مامور من اللہ

(vi) سوال:۔ آپ ایک باعقیدہ مسلمان ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ خدا نے آپ کو اس امر کے لئے مامور کیا تھا کہ آپ اس ملک کی تاریخ میں ایک خاص (Role) ادا کریں؟

جواب:۔ مجھے بہت اچھا مسلمان ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں ہوا۔ میں ایک ادنیٰ معتقد ہوں۔ ہم میں سے ہر ایک بنے ——— اور سب سے زیادہ میں خود اپنے متعلق کہوں گا کہ میں نے بہت سے گناہ کئے ہیں۔ لیکن فوج کا ماحول آپ کو کچھ باتیں سکھاتا ہے اس لئے بعض امور کو ماننا ہی پڑتا ہے۔ جب آپ اس شاہراہ پر نگاہ بازگشت ڈالیں جس پر آپ آرمی میں شامل ہونے کے دن سے آج تک چلتے آرہے ہیں، تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کس کس قسم کے جانکاہ مراحل سے گذرے ہیں ——— جنگیں۔ لڑائیاں۔ جانگسل حادثات وغیرہ۔ میں جب ان حادثات پر نگاہ ڈالتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ میں آج زندہ کس طرح ہوں؛ کتنے ہی ایسے مقامات آئے جہاں میں قتل ہو جاتا۔ مارا جاتا۔ جنگی قیدی بنا لیا جاتا۔ لہٰذا، آپ کو آرمی میں رہ کر خدا پر ایمان لانا پڑتا ہے ——— خدا پر ایمان اور اپنی قسمت اور مقدر پر ایمان۔ اس ایمان کو بڑا محکم ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد آپ کو اپنی محنت شاقہ پر یقین رکھنا چاہیئے ..... میں جب ان تمام امور کو یکجا اپنے سامنے رکھتا ہوں تو جس وقت مجھے سابق وزیر اعظم نے چیف اوف آرمی کے منصب کے لئے منتخب کیا تو یقین مانئے کہ میں صرف حیران نہیں ہوا۔ اس سے لرز گیا ——— واقعی لرز گیا۔ اس وقت دس افسر مجھ سے سینئر تھے اور میں ان میں کا ایک تھا۔ میں وزیر اعظم (مسٹر بھٹو) کو جانتا تک نہیں تھا۔ سیاسی میدان کے کبھی قریب تک۔ نہیں پھٹکا تھا۔ اور اپنے خاندان بھر میں سب سے پہلا شخص تھا جو آرمی میں شامل ہوا تھا!

(vii) سوال: کیا اس سے پہلے آپ مسٹر بھٹو سے کبھی نہیں ملے تھے؟

جواب:۔ ایک آدھ مرتبہ۔ یونہی سرسری طور پر۔ (ان حالات میں) یکایک (ایسا ہوا کہ ۵ جولائی ضیاء الحق برسر اقتدار آگیا (اس کے متعلق سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ) ایسا ہونا مقدر تھا ——— مسٹر اکبر! آپ یقین کیجئے کہ میں نہ اس کے قابل تھا۔ نہ اب بھی اس کے قابل ہوں۔ میں اور میرے رفقاء اگر اس دوران میں کچھ کر سکے ہیں تو یہ محض خدا کے فضل و کرم سے ہے۔ آپ یقین مانئے ——— اور میں کسر نفسی سے کام نہیں لے رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ جو کچھ ۱۹۷۷ء میں ہوا تھا، میرے خیال میں اس میں خدا کا ہاتھ تھا۔ اور اس کے بعد جو کچھ میں کر سکا ہوں، وہ میری ذاتی کوششوں کا نتیجہ

نہیں۔ اس لئے کہ جب میں گذشتہ پانچ سال کے ریکارڈ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو میں دیکھتا ہوں کہ، میں نے اس قدر حماقتیں (BLUNDERS) کی ہیں جن کی ہمیں سزا ملنی چاہیئے تھی۔ ہم نے (مثلاً) ایک ایسا قدم اٹھایا جس کے منفی نتائج مرتب ہونے چاہئیں تھے۔ لوگوں کو سڑکوں پر نکل آنا چاہیئے تھا۔ لیکن (ہوا یہ کہ) ہم نے غلط قدم اٹھایا اور وہ ہمارے حق میں مفید ثابت ہوا!

سزائیں

(viii) حدود کی سزاؤں کی سختی کی مدافعت کرتے ہوئے صدر مملکت نے کہا کہ ان سے متعلق قانونِ شہادت اس قدر سخت ہے کہ گذشتہ پانچ سال میں، میں نے کسی کا ہاتھ کاٹ سکا ہوں، نہ بجز شراب نوشی، کسی جرم میں، کسی پر کوڑے برسائے گئے ہیں..... سزائے رجم کو انہوں نے اسلام کے مطابق قرار دیا۔

(ix) سوال:۔ میں کچھ غربت و افلاس اور جاگیرداری کے متعلق دریافت کرنا چاہتا ہوں؟

اکتنازِ دولت

جواب:۔ جاگیرداری! اسلام کی رُو سے، ایک شخص جس قدر جی چاہے دولت جمع کر سکتا ہے۔ بس اس پر اسے ٹیکس ادا کرنا ہوگا (جسے زکوٰۃ کہا جاتا ہے) اگر ہر شخص زکوٰۃ ادا کرتا جائے تو ملک میں اتنے لوگ دولت مند دکھائی نہیں دیں گے۔ اس کے علاوہ، مملکت کے دوسرے ٹیکس بھی ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرنے سے یہ ٹیکس معاف نہیں ہو جاتے۔ لہٰذا، اسلام میں بنیادی اصول دولت کی تقسیم کا ہے۔

(x) سوال:۔ عورت، ملک کی لیڈر کیوں نہیں ہو سکتی؟

عورت

جواب:۔ اس لئے کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا (قہقہہ)..... عورت، اخلاقی لیڈر شپ میں بلند ترین مقام حاصل کر سکتی ہے لیکن سربراہ مملکت مرد ہی ہو سکتا ہے۔

(xi) آخری دو سوال:۔

(i) پاکستان کے متعلق آپ کا خواب کیا ہے؟

جواب:۔ پاکستان کے متعلق میرا خواب یہ ہے کہ یہ ایک مثالی مملکت ہو۔ یہ مملکت امن و سلامتی کا حصار ہوتی ہے اور روشنی کی ایسی شمع جو امید کی کرن اپنے ساتھ لاتی ہے اور تاریکی کو مدھم کر دیتی ہے۔ یہ میرا مثالی تصور ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہمارے سب خواب سچے ثابت نہیں ہوتے۔ لیکن ہم کم از کم، ان کے قریب پہنچ سکتے ہیں۔

(ii) دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ کا خود اپنے متعلق کیا خواب ہے؟

جواب:۔ بڑا (صاف اور) سادہ۔ اور وہ یہ کہ جب میں جاؤں تو لوگ کہیں یہ ایک دیانتدار (HONEST) آدمی تھا۔

(۰)

باسمہٖ تعالیٰ

بتقریب یوم آزادیٔ پاکستان

قومیں کیوں تباہ ہوتی ہیں؟

یہ تاریخی کہانیاں نہیں۔ ان میں ہمیں تنبیہہ کی گئی ہے کہ تم بھی ویسی روش اختیار کرو گے تو تم بھی تباہ ہو جاؤ گے

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قومیں کیوں تباہ ہوتی ہیں؟

پرویز

قرآن کریم انسانی تاریخ کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اتنی اہمیت کہ اس نے کہا ہے کہ وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِکُمْ۔ (۲۴/۳۴) ہم نے تمہاری طرف واضح قوانینِ زندگی نازل کئے اور اس کے ساتھ اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں بھی۔ اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں بیان کرنے سے مقصد کیا تھا، یہ نکتہ قابلِ غور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس طرح خارجی کائنات میں کوئی واقعہ یونہی اتفاقیہ نمودار نہیں ہوتا، وہ نتیجہ ہوتا ہے ان قوانینِ فطرت کی کارفرمائی کا جن کے مطابق یہ عظیم کارگہِ کائنات سرگرمِ عمل ہے۔ اسی طرح انسانوں کی دنیا میں بھی کوئی تبدیلی یونہی بلا اسباب رونما نہیں ہو جاتی۔ اس کے لئے بھی خدا کی طرف سے اٹل قوانین مقرر ہیں۔ جو قوم ان قوانین کے مطابق اپنا نظام قائم کرتی ہے وہ زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے۔ جو ان کی خلاف ورزی کرتی ہے وہ زوال پذیر ہو کر رفتہ رفتہ تباہ ہو جاتی ہے۔ قرآن نے وہ قوانین بیان کئے ہیں جن سے قوموں کا عروج و زوال وابستہ ہے اور ان کی صداقت کے ثبوت کے لئے، اقوامِ سابقہ کی سرگزشتوں کو بطور شہادت پیش کیا ہے۔ یعنی اس نے کہا ہے کہ دیکھو! فلاں قوم نے اپنے ہاں اس قسم کا نظام قائم کیا تو اسے زندگی کی شادابیاں اور خوشگواریاں حاصل ہو گئیں اور فلاں قوم نے اس کی مخالفت کی تو وہ تباہ و برباد ہو گئی۔ اور اس کے بعد وہ قومِ مخاطب اور آنے والی اقوامِ عالم سے کہتا ہے کہ ان قوانین اور ان کی صداقت کے ثبوت میں پیش کردہ ان شواہد کی روشنی میں تم خود فیصلہ کر لو کہ تم زندہ اور پائندہ رہنا چاہتے ہو یا تباہ و برباد ہونا۔ اگر زندہ و شاداب رہنا چاہتے ہو تو اپنا نظام قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل کرو۔ اگر تباہ ہونا چاہتے ہو تو ان کے خلاف روش اختیار کر لو۔ جس قسم کی تمہاری روش ہو گی، اسی قسم کا نتیجہ تمہارے سامنے آجائے گا۔ دیکھئے! وہ اس حقیقت کو کیسے واضح الفاظ میں سامنے لاتا ہے جب کہتا ہے کہ

دیدۂ عبرت کشا! اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ کیا یہ لوگ دنیا میں چلے پھرے نہیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے ہو گزری ہیں اور انہوں نے اسی قسم کی روش اختیار کر رکھی تھی جس پر یہ گامزن ہیں، تو ان کا انجام کیا ہوا؟ انکی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کی ٹھیکریاں، ان کی عظمتِ گزشتہ کی درخشندہ داستانیں بھی بیان کرتی ہیں اور اس کے بعد

ان کی تباہی و بربادی کی مرثیہ خواں بھی ہیں۔ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْهُمْ وَأَشَدَّ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ۔ وہ قومیں تعداد میں بھی اس قوم سے زیادہ تھیں جو اب تمہاری مخاطب ہے اور قوت و حشمت میں بھی اس سے بڑھ کر۔ اُن کی شان و شوکت کے جھنڈے زمین میں گڑے ہوئے تھے۔ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ۔ (۴۰/۸۲) لیکن جب ان کے غلط نظام کے تباہ کن نتائج کے ظہور کا وقت آیا تو نہ ان کی تعداد کی کثرت ان کے کسی کام آسکی اور نہ ہی ان کی دولت و قوت انہیں اس تباہی سے بچا سکی۔ یہ تباہی ان پر اچانک نہیں آگئی تھی۔ خدا نے ان کی طرف اپنے پیغامبروں کو بھیجا تاکہ وہ انہیں بتا دیں کہ جس راستے پر وہ چلے جا رہے ہیں وہ انہیں تباہی کے جہنم کی طرف لے جا رہا ہے۔ فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِندَهُم مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ۔ (۴۰/۸۳) لیکن وہ لوگ اپنی دولت اور قوت کے نشے میں اس قدر بدمست اور اپنی ہنرمندیوں اور عیارانہ کارستانیوں پر اس قدر فرحاں اور نازاں تھے کہ انہوں نے ان پیغامبرانِ انقلابِ آسمانی کی تنبیہات کا مذاق اڑایا اور ان سے کہا کہ ہم نے جو نظام وضع اور اختیار کر رکھا ہے، اس سے ہمارے ہاں ہُن برس رہا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ ہم تباہیوں کی طرف بڑھے چلے جاتے ہیں۔ آپ تشریف لے جائیے۔ ہم اپنے معاملات کو آپ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ہوا وہی جو اُن سے وہ آسمانی پیغام رساں کہتے تھے۔ انہیں اُن تباہیوں نے گھیر لیا جن کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے۔ فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَحْدَهُ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ مُشْرِكِينَ (۴۰/۸۴) جب انہوں نے اس تباہی کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو کہا کہ ہم نظامِ خداوندی کی صداقت پر ایمان لاتے ہیں اور جس نظام کو اس کا ہمسر ٹھہرایا کرتے تھے، اُسے مسترد کرتے ہیں۔ فَلَمْ يَكُ يَنفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا۔ لیکن جب تباہی سامنے آکھڑی ہو تو اس وقت غلط روش سے اجتناب کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ پھر اس قوم کی ہلاکت اٹل ہوتی ہے۔

یہ بیان کرنے کے بعد کہا کہ یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی جو صرف کسی ایک خاص قوم کے ساتھ مخصوص تھی۔ سُنَّتَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ۔ (۴۰/۸۵) یہ خدا کی اٹل روش ہے جو تمام اقوامِ سابقہ کے سلسلہ میں جاری و ساری رہی ہے۔ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (۳۳/۶۲)۔ اور تو خدا کی اس روش، اس قانونِ حکم میں، کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔ یہ اٹل اور غیر متبدل قانون ہے جس کے مطابق قوموں کی زندگی اور موت کے فیصلے ہوتے ہیں۔

یہ سنت اللہ ہے

آگے بڑھنے سے پہلے، ضمناً یہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود ہمارے دور میں، ایک اور گوشے سے بھی تاریخ کی اہمیت کی آواز بلند کی گئی ہے اور وہ ہے مارکسزم کا گوشہ۔ اس کے پیش کردہ نظریۂ تاریخ کی تفصیل طول طویل ہے لیکن اس کا ملخص یہ ہے کہ ایک معاشی نظام پیدا ہوتا ہے، پروان چڑھتا ہے۔ جب وہ اپنے عہدِ شباب کو پہنچتا ہے تو اس میں سے ایک اور نظام نمودار ہو جاتا ہے جو اس پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نظام کا بھی وہی حشر ہوتا ہے جو اس سے ماسبق نظام کا ہوا تھا۔ انسان کی ساری تاریخ انہی تضادات کی باہمی کشمکش کی داستان ہے جسے جدلیت (DIALECTICISM) کہا جاتا ہے تضادات کی یہ کشمکش اس قدر پُرقوت اور مہیب ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ انسان اس کے ہاتھوں مجبور اور بے بس ہے۔ جب مارکس سے پوچھا گیا کہ وہ کون سی ایسی قوت ہے جو اس قدر اٹل اور شدید زور والی ہوئی

اشتراکیت کا نظریۂ تاریخ

ہے تو اس نے کہا کہ اس قوت کا نام تاریخی وجوب (HISTORIGAL NECESSIT) ہے۔ یہ اصطلاح ایسی مبہم بلکہ موہوم ہے کہ آج تک کوئی بتا ہی نہیں سکا کہ اس سے بالآخر مفہوم کیا ہے۔ وہ شے ہے کیا جسے اس قدر مہیب اور لافانی قوت حاصل ہے کہ دنیا کی کوئی قوت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، کوئی اس کا جواب نہیں دے سکا، نہ دے سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ مارکس نے خدا اور اس کے قوانین کا انکار کیا تو اس سے اس کے تحت الشعور میں ایک خلا پیدا ہو گیا۔ لیکن، ۔ خلا محال ہے فطرت کے کارخانے میں ۔ اسلئے اسے اس خلا کو پُر کرنے کے لئے کسی قوت پر ایمان لانا ضروری تھا۔ اس کے لئے اس نے "تاریخی وجوب" کی ایک موہوم سی اصطلاح وضع کر لی اور اس طرح اپنے لاشعوری خلا کو پُر کر لیا۔ حقیقت بادنیٰ تعمق سمجھ میں آجائے گی کہ کاروانِ انسانیت جن راستوں سے گزرا ہے، تاریخ ان کے ریکارڈ کا نام ہے اور بس۔ اس ریکارڈ کو کون سی قوت حاصل ہو سکتی ہے؟ یہ ریکارڈ ہمیں یہ بتا سکتا ہے کہ فلاں دور میں کس قسم کے ذرائع پیداوار اختیار کئے گئے اور فلاں زمانے میں کس قسم کا معاشی نظام رائج کیا گیا، اور اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا۔ تاریخ، بہرحال انسانی سعی و کاوش اور فکر و عمل کا ریکارڈ ہے اور ریکارڈ کو کوئی قوت حاصل نہیں ہوتی۔

اشتراکیت میں تاریخ کا ایک اور تصور بھی ہے جو اس سے بھی کہیں زیادہ گمراہ کن ہے۔ اسے کہتے ہیں تاریخ کی مادی تعبیر (THE MATERIALIST CONCEPT OF HISTORY) اس تصور کی رُو سے کہا جاتا ہے کہ انسانی تاریخ میں جس قدر ٹکراؤ سامنے آتے ہیں، ان کا جذبۂ محرکہ محض معاشی (یعنی مادی مفاد کا تصادم) تھا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انسان کے سامنے مسئلہ سارا روٹی کا ہے۔ اس کے سوا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ حق و باطل، خیر و شر، ہدایت و ضلالت، نیکی بدی وغیرہ کے تصورات یا امتیازات سب واہمہ ہیں۔ انگلز (ENGELS) اس باب میں لکھتا ہے:۔

تاریخ کے مادی تصور کی ابتدا اس اصول سے ہوتی ہے کہ پیداوار اور پیداوار کے ساتھ اس کی تقسیم ہی سوسائٹی کے ہر نظام کی بنیاد ہوتی ہے ..... اس تصور کی رو سے، ہر تمدنی تغیر یا سیاسی انقلاب کی علت العلل۔ اسکے بنیادی اور اصلی سبب کو، لوگوں کے دلوں کے اندر، یا خارجی حق و صداقت اور عدل و انصاف کے متعلق ان کی بڑھتی ہوئی بصیرت میں تلاش نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے دیکھنا یہ چاہیئے کہ ان لوگوں نے پیداوار اور اس کی تقسیم کے طریقوں میں کیا تبدیلیاں کی تھیں۔ بالفاظِ دیگر ان تصادمات اور انقلابات کے بنیادی سبب کو ان کے فلسفۂ زندگی (یا نظریۂ حیات) میں تلاش نہیں کرنا چاہیئے۔ اُس دور کی اقتصادیات میں تلاش کرنا چاہیئے۔

(ANTI DUHRING — P. 300)

جہاں تک آئیڈیالوجی (یا نظریۂ حیات) کا تعلق ہے، انگلز لکھتا ہے کہ:۔

(اس میں شبہ نہیں کہ) آئیڈیالوجی کو نام نہاد مفکر، شعوری طور پر عمل میں لاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ شعور جھوٹا (FALSE CONSCIOUSNESS) ہوتا ہے۔ اس کے عمل کے حقیقی محرکات اس کی نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا عمل مبنی بر نظریہ کہلا ہی نہ سکے۔ لہٰذا وہ جھوٹے یا سطحی محرکات کو حقیقی محرکات تصور کر لیتا ہے۔

(MARX — ENGELS CORRESPONDENCE, P. 510–511)

یعنی جنہیں ہم حق و باطل کی لڑائیاں یا تصادمات کہتے ہیں، وہ حق اور باطل کی لڑائیاں نہیں تھیں، وہ درحقیقت معاشی لڑائیاں تھیں۔ حق کی خاطر لڑنے والے مصلحین، حتیٰ کہ حضرات انبیاء کرامؑ (معاذ اللہ) خود فریبی میں مبتلا تھے جو اسے حق و باطل کا تصادم

سمجھ لیتے تھے۔ ان کا حقیقی جذبۂ محرکہ معاشی ہی ہوتا تھا جو شعوری طور پر ان کی نگاہوں سے اوجھل رہتا تھا۔

یہ ہے اشتراکیت کا سب سے اہم نظریۂ تاریخ۔ لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، قرآن کا نظریۂ تاریخ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تاریخ مختلف نظریاتِ حیات کی کشمکش کا ریکارڈ ہے۔ جو نظریہ قوانینِ خداوندی کے مطابق ہو اسے کامیابی حاصل ہوتی ہے جو ان کے خلاف ہو، وہ شکست کھا جاتا ہے۔ تاریخ کا ریکارڈ قرآن کے اس دعویٰ کی صداقت کی شہادت پیش کرتا ہے۔ اس میں خود کوئی قوت نہیں ہوتی۔ قوت قانون میں ہوتی ہے، قانون کی سرگذشت میں نہیں ۔ اقوامِ سابقہ کی ان سرگزشتوں کو بھی قرآن نے داستان گوئی کے لئے بیان نہیں کیا۔ وہ اپنی مخاطب قوم سے (یعنی ہر زمانے کی اقوام سے) یہ کہتا ہے کہ ان اقوامِ سابقہ کے انجام و عواقب کو سامنے رکھ کر، تم اپنے لئے آپ فیصلہ کر لو۔ جس قوم کی روش تم اختیار کرو گے اسی قوم جیسا انجام تمہارا ہو جائے گا۔

قرآنِ کریم نے اس سلسلہ کا آغاز قوم (حضرت) نوحؑ سے کیا ہے اور مختلف اقوام کی سرگزشتیں بیان کرتا، عہدِ نبی اکرمؐ تک پہنچ گیا ہے۔ ان سطور میں بتایا جائے گا کہ قرآن کریم نے وہ کون سے جرائم (یعنی غلط نظام) بتائے ہیں جن کی وجہ سے یہ قومیں تباہ و برباد ہوئیں اور مقصد اس سے یہ ہے کہ اس کے بعد ہم دیکھیں کہ کیا ہم بھی قومی حیثیت سے انہی جرائم کے مرتکب تو نہیں ہو رہے؟

تمہیدی وضاحت

اس سلسلہ میں دو اہم امور کا تذکرہ ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ غلط روش پر چلنے والی قوم میں مختلف قسم کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن قرآن کریم ان تمام خرابیوں کا ذکر نہیں کرتا۔ اس میں سے صرف اس بنیادی خرابی کا ذکر نمایاں طور پر کرتا ہے جو اس نظام کی اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اور باقی خرابیاں جس کے برگ و بار ہوتے ہیں۔ خدا کا رسول بھی سب سے زیادہ زور اسی بنیادی خرابی کے ازالہ پر دیتا، اور اسی کو ان کی تباہی کا موجب بتاتا ہے۔ ان اقوام کی سرگزشت کے بعد جب ان بنیادی جرائم کی فہرست ہمارے سامنے آئے گی تو یہ حقیقت واضح طور پر منکشف ہو جائے گی کہ قومیں کس قسم کے جرائم یا غلط نظریاتِ زندگی کی وجہ سے تباہ ہوتی ہیں۔ واضح رہے کہ اصل چیز نظریۂ زندگی یا نظامِ حیات ہے۔ جرائم درحقیقت غلط نظریہ یا تخریبی نظام کا منطقی نتیجہ ہوتے ہیں۔

اور یہیں سے وہ دوسری بات ہمارے سامنے آجاتی ہے جس کا ذکر کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ تباہ ہونے والی قوم میں یہ نہیں ہوتا کہ اس میں کوئی فرد بھی ایسا نہیں ہوتا جس میں خوبیاں یا اچھائیاں نہ ہوں۔ اس میں اچھے افراد بھی ہوتے ہیں لیکن غلط اجتماعی نظام کے تباہ کن نتائج کو ان کی انفرادی نیکیاں روک نہیں سکتیں۔ یہی وجہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً (۸/۲۵)، اس فتنے سے بچتے رہو جب آتا ہے تو صرف انہی لوگوں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیا کرتا جنہوں نے ظلم و جرائم کئے ہوں۔ وہ سب کو بہا کر لے جایا کرتا ہے۔ جب دریا کے بند کو احتیاط سے نہ باندھنے کی وجہ سے سیلاب آجاتا ہے تو وہ صرف انہی کے گھروں کو تباہ نہیں کرتا جو اس تساہل یا تغافل کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ وہ بستیوں کی بستیاں تباہ کر کے رکھ دیا کرتا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کوئی قوم اپنے ہاں نظام کس قسم کا رائج کرتی ہے۔ غلط نظام میں بسنے والے وہ افراد بھی تباہی سے نہیں بچ سکتے جنہوں نے انفرادی طور پر کوئی جرم نہ کیا ہو۔ اس سے وہی لوگ بچ سکتے ہیں جو اس نظام کو مسترد کر کے یا تو اس کی جگہ صحیح نظام قائم کریں، یا ان لوگوں سے الگ ہو کر، کسی ایسی جگہ چلے جائیں جو صحیح نظام کے قیام کے لئے سازگار ہو۔ اسے دین کی اصطلاح میں ہجرت کہا جاتا ہے جو قریب قریب ہر رسول کا شیوہ رہا ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم ان اہم اقوام کی سرگزشتوں کی طرف آتے ہیں جنہیں قرآنِ کریم نے نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔

(۰)

قومِ (حضرت) نوحؑ

قرآنِ کریم نے اقوامِ سابقہ کی سرگزشتوں کے سلسلہ کا آغاز قومِ نوح سے کیا ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ قرآنِ کریم تاریخ کی کتاب نہیں، اس لئے وہ ان اقوام کے زمان و مکان کے متعلق گفتگو نہیں کرتا۔ وہ اپنے آپ کو مقصدِ پیشِ نظر تک محدود رکھتا ہے یعنی اس حقیقت تک کہ اس قوم نے اپنے ہاں معاشرہ کس قسم کا قائم کر رکھا تھا۔ اس معاشرہ کی نمایاں خرابیاں کیا تھیں اور اس کا انجام کیا ہوا۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ قرآنِ کریم نے اس سلسلہ میں صرف انہی اقوام کا ذکر کیا ہے جن کے احوال و کوائف سے اُس کی اولین مخاطب (عرب) قوم اچھی طرح واقف تھی اور اسے کرنا بھی یہی چاہیئے تھا۔ مثلاً اگر وہ یہ کہتا کہ دیکھو! پارتھین قوم نے یہ کیا اور اس کا انجام یہ ہوا، تو قومِ مخاطب سب سے پہلے یہ سوال لے اٹھتی کہ پارتھین قوم کون تھی، کہاں تھی، انکی تباہی کیسے ہوئی اور کیا معلوم یہ کچھ ہوا بھی یا نہیں! یہ سلسلۂ بحث و تحقیق شروع ہو جاتا اور اصل مقصد اسی الجھاؤ میں کھو جاتا۔ وہ جن اقوام کا ذکر کرتا ہے ان کی داستانیں، قومِ مخاطب (عربوں) کے ہاں عام تھیں اور ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات، ان کے گرد و پیش اور ان کی مسافرت کے راستوں میں بکھرے پڑے تھے۔ یعنی وہ اقوام جن کے متعلق وہ کہتا ہے کہ يَمْشُونَ فِي مَسَاكِنِهِمْ (۲۰/۱۲۸) جن کی بستیوں میں یہ لوگ چلتے پھرتے ہیں۔ ان اقوام کی سرگزشتوں سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ قرآن نے فقط اتنا بتایا کہ ان کا یہ انجام کیوں ہوا، اور اگر تم بھی وہی کچھ کرو گے تو تمہارا انجام بھی ویسا ہی ہوگا۔

آغازِ داستانِ قومِ نوحؑ

کہا یہ جا رہا تھا کہ قرآنِ کریم نے اس سلسلہ کا آغاز قومِ نوحؑ کی سرگزشت سے کیا ہے۔ تاریخی قیاسات کا رُخ اس طرف ہے کہ یہ قوم دجلہ اور فرات کی وادیوں میں بستی تھی اور ان کا زمانہ کوئی چار پانچ ہزار سال قبل مسیح کا تھا۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ وہ قوم، زمانہ قبل از تاریخ کی دیگر اقوام اور قبائل کی طرح بت پرست تھی۔ ہنوز تمدن کی اس سطح پر بھی نہیں پہنچی تھی جہاں اتنا بھی معلوم ہو کہ سیلاب کی تباہی سے بچنے کے لئے کشتی بنائی جاتی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے کی ترکیب بھی بذریعہ وحی بتائی تھی۔ اور جب وہ لوگ انہیں کشتی بناتے دیکھتے تو ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ جو رسوم و رواج اور زندگی کے طور طریق انہیں آباد و اجداد سے وراثت میں ملے تھے، انہیں بے حد مقدس سمجھتے اور ان پر شدت سے کاربند رہتے تھے۔ وہ ان کے خلاف ایک لفظ تک سننا گوارا نہیں کرتے تھے خواہ وہ کتنا ہی دلائل و براہین پر مبنی کیوں نہ ہو۔ اس قوم کی علمی، ذہنی اور تمدنی سطح تو یہ تھی لیکن معاشرہ میں طبقاتی امتیازات بڑی اہمیت اختیار کر چکے تھے اور یہی اُس معاشرہ کی سب سے بڑی خرابی تھی جسے قرآن نے نمایاں طور پر بیان کیا ہے اور جس کے نتیجہ میں وہ قوم تباہ ہو گئی۔

طبقاتی امتیازات

قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ۔ (۱۷/۷۰) تمام انسان بنیادی طور پر یکساں واجب التکریم ہیں۔ پیدائش کے لحاظ سے انسانی بچوں میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ معاشرہ میں مدارج کا تعین جوہرِ ذاتی اور حسنِ سیرت و کردار

کی رُو سے ہوگا، نہ کہ حسب نسب، پیشہ یا دولت کے معیار کے مطابق۔ یہ تھی وہ بنیادی قدر جسے حضرت نوحؑ نے پیش کیا۔ اور جس کی مخالفت، اور سخت مخالفت، اکابرینِ قوم کی طرف سے ہوئی۔

اس مقام پر ایک اور بنیادی نکتہ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم نے ہر رسول کے سلسلہ میں کہا ہے کہ اس کے انقلابی پیغام کی مخالفت، سب سے پہلے ملاءِ قوم نے کی۔ اس میں قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کے الفاظ اس تکرار و اصرار سے آتے ہیں کہ ایک پارہ (نویں پارہ) کا عنوان ہی قَالَ الْمَلَاُ ہے۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "سردارانِ قوم"۔ عرفی اعتبار سے یہ ترجمہ صحیح ہے۔ لیکن مادہ کے لحاظ سے اس کے معنی ہیں وہ لوگ جن کے برتن ضروریاتِ زندگی کے سامان سے ہر وقت بھرے رہیں۔ یعنی قوم کا دولت مند، خوشحال طبقہ۔ انہی کو قرآن نے دیگر مقامات پر مترفین کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو دوسروں کی کمائی پر عیش و آرام کی زندگی بسر کریں جنہیں زندگی کی آسائشیں بافراط حاصل ہوں۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ جب اور جہاں بھی آسمانی انقلاب کی آواز بلند ہوئی، قوم کے دولت مند، سرمایہ پرست طبقہ نے سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر اس کی مخالفت کی اور ان کی تائید و حمایت مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوئی۔ چنانچہ حضرت نوحؑ نے جب اپنی قوم سے کہا کہ جو غلط نظریات اور مسالک تمہارے معاشرہ میں عام ہو رہے ہیں ان کی جگہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کرو۔ تو فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ۔ تو اس قوم کے اکابرین نے جن کے ہاں دولت کی فراوانی تھی اور اس وجہ سے انہوں نے صحیح مسلکِ زندگی سے انکار اور سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی، اس سے کہا کہ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ۔ (۱۱/۲۷) تم ہمیں کس بات کی دعوت دیتے ہو؟ ہم دیکھ یہ رہے ہیں کہ ہمارے معاشرہ کے نہایت پست درجہ کے، کمینے اور رذیل لوگ تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں۔ نہ انہیں عقل ہے نہ فکر۔ اس لئے وہ بلا سوچے سمجھے تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں اور تم اس فریب میں مبتلا ہو گئے ہو کہ تمہاری دعوت حق و صداقت پر مبنی اور تمہاری پکار بڑی جاذب ہے۔ تم کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے۔ (۱۱/۲۷) وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ (۱۱/۲۷) ذرا بتاؤ تو سہی کہ تمہیں اور تمہارے ان ساتھیوں کو ہمارے مقابلہ میں کون سی فضیلت حاصل ہے جو ہم اس جماعت میں شامل ہو جائیں۔

مخالفت ملاءِ قوم کی طرف سے

اس کے جواب میں حضرت نوحؑ نے کہا کہ جو کچھ میں تم سے کہہ رہا ہوں اسے سوچو اور سمجھو۔ اسے دیکھو اور پرکھو کہ وہ حق و صداقت پر مبنی ہے یا نہیں۔ یہ نہ دیکھو کہ جن لوگوں نے اسے قبول کیا ہے، ان کا پیشہ کیا ہے۔ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (۲۶/۱۱۲) میری نگاہ ان کی سیرت و کردار پر ہے۔ اس سے مجھے کچھ سروکار نہیں کہ وہ کام کاج کیا کرتے ہیں۔ جس معاشرہ کی تشکیل کی میں دعوت دیتا ہوں اس میں معیارِ تکریم و تعظیم، کردار کی بلندی اور جوہرِ ذاتی کی گراں مایگی ہوتی ہے۔ نہ کہ حسب و نسب کی تفریق اور ذاتوں اور پیشوں کی تمیز۔ حسب و نسب کی تفریق انسانی انانیت کا خود ساختہ امتیاز ہے۔ اور پیشوں کا فرق، معاشرہ میں تقسیمِ کار کا فطری نتیجہ۔ لہٰذا ان امور کو شرفِ انسانیت سے کیا واسطہ؟ اگر ایک محنت کش مزدور، کیریکٹر کے اعتبار سے بلند ہے تو وہ اس صاحبِ ثروت سے ہزار درجہ بہتر ہے جس کا کردار پست ہے۔

اس پر ان اکابرینِ قوم نے کہا۔ يٰنُوْحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا۔ (۱۱/۳۲) اے نوح! ہم نے دیکھ لیا کہ تم بہت جھگڑالو واقعہ ہوئے ہو۔ تم نے بہت لمبی چوڑی باتیں کر لیں اور ہم نے سن لیں۔ اس بحث و تمحیص سے کچھ حاصل نہیں۔

ایک فیصلہ کن بات سُن لو۔ وہ یہ کہ ان ذلیل اور کمینے لوگوں کو اپنی جماعت سے نکال دو۔ اس کے بعد ہم تمہارے ساتھ ہو جائینگے۔ ہم ان کے ساتھ بیٹھنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ بھی بھلا کوئی بات ہوئی کہ قوم کے اشراف و احلاف، رؤسا و غرباء، سرمایہ دار اور محنت کش، ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں؟ اس کے جواب میں حضرت نوحؑ نے ان متکبرین سے کہا کہ تمہارا مطالبہ یکسر باطل اور بے ہودہ ہے۔ دعوتِ خداوندی کی رُو سے انسانوں کی وجہِ جامعیت و اخوتِ ایمان ہے۔ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ۔ (۲۶/۱۱۴) میں تمہاری خاطر، ان لوگوں کو جو اس کی دعوت کی صداقت پر ایمان لا چکے ہیں، دھتکار نہیں سکتا۔ وَيَا قَوْمِ مَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ طَرَدْتُهُمْ۔ (۱۱/۳۰) اگر میں انہیں دھتکار دوں، تو تم تو بے شک خوش ہو جاؤ گے، لیکن یہ بتاؤ کہ اس جرمِ عظیم کی پاداش سے جو خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے مجھے ملے گی، مجھے کون بچا سکے گا؟ اگر میں نے ایسا کیا تو إِنِّي إِذًا لَمِنَ الظَّالِمِينَ۔ (۱۱/۳۱)۔ تو میں بھی انہی لوگوں میں سے ہو جاؤں گا جو غریبوں اور مفلسوں کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ تو بڑا ظلم ہوگا۔ میں اس کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔

اس پر انہوں نے کہا کہ اے نوحؑ! تم اگر اس کے لئے آمادہ نہیں ہوتا سے اچھی طرح سن رکھو کہ ہم تمہاری ان حرکتوں کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے۔ تم ان ادنیٰ اور رذیل لوگوں کو سر پر چڑھا کر، طبقاتی امتیازات کو مٹانے کا خیال عام کر رہے ہو۔ یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس سے معاشرہ میں فساد برپا ہو جائے گا ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔ لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ..... لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ۔ (۲۶/۱۱۶)، اگر تم اس فتنہ پردازی سے باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے۔

چنانچہ انہوں نے حضرت نوحؑ اور ان کی جماعت کے خلاف پراپیگنڈا کا ایک منصوبہ تیار کیا جس میں مذہبی پیشوائیت ان کا مؤثر ترین آلۂ کار تھی۔ وجہِ مخالفت تو وہ تھی جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت ہر فتنہ کو مذہب کا رنگ دیکر عوام کے جذبات کو مشتعل کرتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ڈگڈگی بجانی شروع کر دی کہ يُرِيدُ أَنْ يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَنْزَلَ مَلَائِكَةً مَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ۔ (۲۳/۲۴)۔ لوگو! دیکھو! یہ نیا فتنہ اٹھا ہے۔ یہ تمہیں تمہارے اسلاف کے مذہب سے منحرف کرانا چاہتا ہے۔ یہ ان معبودوں کی مخالفت کرتا ہے جنہیں تمہارے آباء و اجداد پوجتے چلے آئے ہیں۔ امیر اور غریب کا فرقِ خدا کا پیدا کردہ ہے۔ معزز اور ذلیل کی تفریق پیدائشی ہے۔ یہ ان امتیازات کو مٹا کر مساوات کی غیر فطری دعوت دیتا ہے۔ یہ کفر ہے، الحاد ہے۔ یہ بالکل انوکھی بات ہے۔ مَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ۔ (۲۳/۲۴)، ہم نے اس قسم کی باتیں اپنے آباء و اجداد سے کبھی نہیں سنیں۔ یہ بہت بڑا فتنہ ہے، تم اٹھو اور اس فتنہ کا سر کچل کر رکھ دو۔

یہ تھا وہ مقام جہاں حضرت نوحؑ نے (قرآن کریم کے الفاظ میں) اپنے رب کو پکارا اور کہا تھا کہ اس قوم کے سعادت مند افراد نے حق و صداقت کی دعوت کو قبول کر لیا ہے۔ اس کے باقیماندہ افراد میں اصلاح کا کوئی امکان نہیں۔ لہٰذا انہیں تباہ ہو جانا چاہیئے۔ اس کے لئے انہوں نے دلیل بڑی وقیع دی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر معاشرہ کی یہ خرابی انہی موجودہ افراد تک محدود ہوتی تو اسے برداشت کر لیا جاتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جو نسل ان سے آگے چلے گی وہ بھی انہی نظریات کی حامل اور اسی انداز معاشرت کی علمبردار ہوگی۔ اس طرح یہ وجہِ تفریق انسانیت انداز معاشرہ نسلاً بعد نسلٍ آگے بڑھتا چلا جائے گا اور یہ روش عالمگیر ہو جائے گی۔ اس لئے رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا۔ (۷۱/۲۶)، یا الٰہی! ان لوگوں کا نام و نشان تک مٹا دے۔ إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا۔ (۷۱/۲۷)، اگر ان لوگوں کو علی حالہٖ چھوڑ دیا گیا تو یہ دوسرے لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے اور ان کی آنے والی نسل بھی، جو انہی کی گود میں

پروان چڑھے گی، انہی نظریات کی حامل ہوگی۔

معیارِ قومیت

یہ تھا وہ جرمِ عظیم جس کی پاداش میں وہ قوم تباہ ہوگئی۔ ان تباہ ہونے والوں میں خود حضرت نوحؑ کا بیٹا بھی تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن ایک اور نکتہ سامنے لایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ سے وعدہ کیا تھا کہ یہ قوم سرکش تو غرق ہو جائے گی لیکن میں "تیرے اہل" (یعنی تیرے اپنوں کو) بچالوں گا۔ جب حضرت نوحؑ نے دیکھا کہ ان کا بیٹا بھی غرق ہونے والوں کے زمرے میں شامل ہے تو انہوں نے کہا کہ بارالٰہا! تو نے وعدہ کیا تھا کہ تو میرے اہل کو بچا لے گا۔ تو بیٹے سے بڑھ کر اہل کون ہو سکتا ہے۔ اسے کیوں نہیں بچایا جاتا؟ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملا کہ اے نوح! یہ تیری بھول ہے جو تو اس لڑکے کو محض اس بنا پر کہ اس کے ساتھ تیرا خون کا رشتہ ہے، اپنے اہل میں سے سمجھتا ہے۔ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ۔ یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ یہ یگانہ نہیں، بیگانہ ہے۔ اس لئے کہ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (۱۱/۴۶)، اس کے اعمال و کردار معیارِ خداوندی کے مطابق نہیں۔

یہاں قرآن نے اپنے اور بیگانے کا ایسا بنیادی اصول بیان کر دیا ہے، جو اسلامی نظریۂ قومیت کی اساس قرار پاگیا یعنی (حضرت) نوح کا بیٹا، خون، رنگ، زبان، وطن کے اشتراک کے باوجود اپنوں میں سے قرار نہ پایا۔ اپنوں میں سے وہی سمجھے گئے جو ایمان کے رشتے میں منسلک تھے۔ دوسرے مقام پر کہا گیا ہے کہ حضرت نوحؑ کی بیوی بھی چونکہ ایمان میں شریک نہ تھی اس لئے وہ بھی غیر قرار دے دی گئی۔

قرآنِ کریم نے اپنے بلند، عالمگیر، غیر متبدل اصولوں کی صداقت کے لئے جس قوم کی سرگزشت سے آغازِ داستان کیا، اس میں بتایا یہ گیا ہے کہ

(۱) جس قوم میں طبقاتی ناہمواریاں پیدا ہو چکی ہوں، جہاں اشراف اور رذائل کی تفریق پیدائش کی رُو سے کی جائے، جس میں عزت کا معیار دولت ہو، جس میں عام پیشوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے، جس میں رُوسا اسے برداشت نہ کر سکیں کہ مفلس اور غریب ان کے برابر بیٹھ جائیں —

(۲) جس قوم کا مسلک یہ ہو کہ جو کچھ اسلاف سے ہوتا چلا آرہا ہے، اس پر غور و فکر کرنا کفر و الحاد ہے، اور

(۳) جس قوم میں معیارِ قومیت، رنگ، نسل، خون، وطن، زبان کا اشتراک ہو نہ کہ ایمان کا رشتہ۔

وہ قوم آخر الامر تباہ ہو کر رہتی ہے — اب آگے بڑھیے۔

لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر، ایک اور اہم بنیادی نکتہ کو بھی سامنے رکھیے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، ایک رسول جس قوم کی طرف آتا تھا اس میں ہر قسم کی خرابیاں پائی جاتی تھیں لیکن ان میں ایک خرابی اساسی اور بنیادی حیثیت رکھتی تھی۔ اس رسول کا مقصد صرف اس ایک خرابی کا ازالہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس معاشرہ کو تمام خرابیوں سے پاک اور صاف کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے وہ کوئی خارجی علاج تجویز، یا میکانکی طریق کار اختیار نہیں کرتا تھا۔ وہ اس قوم کو اصولی تعلیم دیتا تھا جس سے ان کا اندازِ نگاہ بدل جائے اور اس طرح ان کا معاشرہ ان خرابیوں سے پاک ہو جائے۔ یہ اصولی تعلیم کیا تھی؟ قرآن نے اسے دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے اور کہا ہے کہ ہر رسول، اپنی قوم کو یہی دعوت دیتا تھا۔ وہ دعوت کیا تھی؟ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ۔ (۷/۵۹)، اے میری قوم کے لوگو! تم صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت، حکومی، فرماں پذیری اختیار کرو۔ لَا تَعْبُدُوْا اِلَّا اللّٰهَ (۱۱/۲)، اس کے سوا کسی اور کے احکام و قوانین کی اطاعت نہ کرو۔ یہ تھا ان کی ساری خرابیوں کا علاج، مع اس بنیادی خرابی کے جس کی طرف وہ

ان کی توجہ خاص طور پر مبذول کراتا تھا۔ یاد رکھیے۔ قرآن کریم چیچک کا علاج ہر آبلہ پر پھاہا رکھنے سے نہیں کرتا۔ اس سے مرض کا ازالہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ علاماتِ مرض کے بجائے علتِ مرض کا ازالہ کرتا ہے اور جب علت کا ازالہ ہو جاتا ہے تو علامات خود بخود مفقود ہو جاتی ہیں۔ وہ کہتا یہ ہے کہ قوموں کی زندگی میں سیاسی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی، تمدنی، حتیٰ کہ انفرادی خرابیاں الگ الگ نہیں ہوتیں۔ وہ برگ و بار ہوتی ہیں غلط نظامِ زندگی کا۔ لہٰذا، ان کا علاج بھی الگ الگ نہیں ہو سکتا۔ اس غلط نظام کی جگہ صحیح نظام (جو وحیٔ خداوندی پر مبنی ہو) نافذ کر دینے سے ہو سکتا ہے۔ یہی خدا کا تجویز کردہ علاج ہے اور یہی آسمانی انقلاب لانے والے حضراتِ انبیاء کرامؑ کا طریقِ کار تھا۔ اسی طریق کو اسلامی نظام کہا جاتا ہے۔

بہرحال ہم نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم کے ابدی اصول کے مطابق، طبقاتی تفریق معاشرہ کی تباہی کا موجب ہوتی ہے ضمناً قرآن نے تاریخی سرگزشتوں کے سلسلہ کی ابتدا اس سے کی ہے، اور یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ اس سلسلہ کی آخری کڑی میں بھی اسے دہرایا گیا ہے۔ یعنی حضورؐ نبی اکرم کی قوم (قریش) کے سرداروں نے بھی بعینہٖ یہی اعتراض کیا اور انہیں بھی بعینہٖ یہی جواب دیا گیا۔

لیکن یہاں قرآن نے اس واقعہ کے بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ بتایا کہ اس امتیاز سے تباہی کیوں آتی ہے۔ فرمایا کہ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ (۶/۵۳) یعنی یہ طبقات ہمیشہ ایک دوسرے کے لئے فتنہ اور مصیبت کا موجب بنتے ہیں۔ زمانہ نزولِ قرآن تک یہ بات تو ہر ایک کی سمجھ میں آ سکتی تھی کہ بالادست طبقہ کس طرح زیردست طبقہ کے لئے مصیبتوں کا موجب ہوتا ہے۔ وہ ان پر کیسے کیسے ظلم و ستم کرتا ہے۔ لیکن یہ بات بمشکل سمجھ میں آ سکتی تھی کہ زیردست طبقہ بھی بالادست طبقہ کے لئے فتنہ کا موجب ہو سکتا ہے۔ یہ بات، اس زمانہ میں سامنے آئی ہے اور اب لوگوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ طبقاتی امتیاز، نہ صرف زیردست طبقہ کے لئے باعثِ مصیبت ہے بلکہ یہ خود بالادست طبقہ کے لئے بھی فتنہ کا موجب ہے۔ قرآن نے یہ بات چودہ سو سال پہلے کہی تھی۔

یہ تھی داستانِ قومِ نوحؑ۔ اب آگے بڑھیے۔

قومِ عاد

قومِ نوحؑ کے بعد، قرآن کریم، قومِ عاد کی سرگزشت سامنے لاتا ہے جس کی طرف حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے تھے۔ مؤرخین کی تحقیق یہ ہے کہ یہ بڑی عظیم الشان قوم تھی جو ایک طرف یمن سے شروع ہو کر خلیج فارس کے ساتھ ساتھ عراق تک جا پہنچی تھی اور دوسری طرف عرب سے نکل کر، مصر و شام تک حکمران تھی۔ تقریب دو اڑھائی ہزار سال قبل مسیح کے زمانے میں اس کا ستارہ عروج پر تھا۔ قرآن کریم نے بھی اس قوم کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے جس سے وہ (لیں سمجھئے گویا) موجودہ زمانے کی مغربی اقوام کے مماثل نظر آتی ہے۔ ایک طرف وہ قوت و حشمت اور مرفہ الحالی اور فارغ البالی میں امتیازی حیثیت رکھتی تھی اور دوسری طرف علم و حکمت اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے بھی نمایاں مقام پر سرفراز تھی۔ قرآن کریم نے زَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً (۷/۶۹) کہہ کر ان کی مادی وسعتوں اور توانائیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وَلَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ (۸۹/۸) کے اضافہ سے یہ بتایا ہے کہ اس کی ہمعصر اقوام میں کوئی اس کے ہمسر نہیں تھی۔ انہیں اَنعام و بنین اور جنّات و عیون کی بخشائشیں بافراط حاصل تھیں (۲۶/۱۳۳-۱۳۴) یعنی مال مویشی کی بھی کثرت اور یہ جنبہ بھی بہت وسیع۔ لہلہاتے باغات اور

سرسبز و شاداب کھیتیاں بھی بکثرت اور چشموں کا آبِ مصفا بھی رواں دواں۔ یہی اُس زمانے کی دولت اور قوت تھی جو اُس قوم کو اس فراوانی سے حاصل تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْئِدَةً (۴۶/۲۶) انہیں سمع و بصر کی قوتیں بھی حاصل تھیں اور قلب و دماغ کی صلاحیتیں بھی۔ یعنی اس زمانے کی علمی سطح کے مطابق، اشیائے فطرت کو مسخر کرنے اور ان سے مفید مطلب نتائج اخذ کرنے کی صلاحیتیں۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ۔ (۲۹/۳۸) وہ جاہل اور بے بصر قوم نہیں تھی، دانا و بینا تھی۔ علم و ہنر سے بہرہ یاب تھی۔ ان کی تمدنی زندگی کا یہ عالم تھا کہ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ (۲۶/۱۲۹) وہ ایسے محکم قلعے اور سنگین حصار بناتے تھے گویا انہیں اس سرزمین پر ہمیشہ حکومت کرنی ہے۔ یہاں تک کہ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ۔ (۲۶/۱۲۸) وہ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر اپنی یادگاریں تعمیر کرتی تھیں۔ ضمناً، یہاں قرآن کریم نے ایک لفظ کے اضافہ سے ان کی یادگاروں پر ایسی گہری تنقید کی ہے جس کی زد انہی کی یادگاروں تک محدود نہیں بلکہ وہ ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آتی ہے جس کا اطلاق ہر زمانے اور ہر قوم کی یادگاروں پر یکساں طور سے ہوتا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ وہ ایسی یادگاریں بناتے تھے جن کا افادی پہلو کوئی نہیں تھا۔ اس سے محض ان کی انانیت کا اظہار مقصود ہوتا تھا۔ مثلاً بڑے بڑے اونچے مینار یا محکم سنگین اور فولادی چٹانیں، جن پر صَرف تو اتنا زیادہ ہو لیکن قوم یا انسانیت کو اُن سے فائدہ کچھ نہ پہنچے۔ یعنی محض خودنمائی کی خاطر عبث و بےکار اسراف!

قرآن کریم نے اس قوم کے جرائم کی تفصیل نہیں بتائی۔ لیکن اس نے جو کچھ اجمالاً کہا ہے اس میں ساری تفاصیل سمٹ کر آ گئی ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ وہ قوم المجرمین تھی۔ عربی زبان میں جَرَمَ کہتے ہیں کسی کے درخت کا پھل کاٹ کر اور توڑ کر اپنے ہاں لے آنا۔ بھیڑ کی اون مونڈ لینا۔ آپ دیکھئے کہ اس ایک لفظ میں اس قوم کے نظام کا پورے کا پورا نقشہ کس طرح نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ یعنی ایسا نظام جس میں سلب و نہب، استحصال (EXPLOITATION) و استعمار، معمول ہو جس میں دوسروں کی محنت کی کمائی کو ہر ممکن حربہ سے لوٹ لیا جائے۔ جس میں کیفیت یہ ہو کہ :

قوم المجرمین

> اُمتے بر اُمتے دیگر چرد
> دانہ ایں می کارد، آں حاصل بُرد

محنت کوئی کرے، اس کا حاصل کوئی اور لے جائے اور وہ بھی اس طرح کہ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ۔ (۲۶/۱۳۰) وہ کمزوروں اور ناتوانوں کو اپنے پنجۂ استبداد میں اس طرح جکڑتے تھے کہ ان بیچاروں کی ہڈیاں تک ٹوٹ جاتی تھیں۔ ان کی گرفت اس قدر محکم ہوتی تھی کہ کوئی اس سے دستگاری حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے حکمران جَبَّارٍ عَنِيْدٍ تھے۔ (۱۱/۵۹) بڑے ظالم اور جابر، بڑے سرکش اور متکبر۔ دوسری جگہ ہے۔ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (۴۱/۱۵) انہوں نے ناحق ظلم و ستم پر کمر باندھ رکھی تھی اور نخوت اور تکبر کا یہ عالم تھا کہ وہ دھڑلے سے کہتے تھے کہ ہماری طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ جو اس کی جرأت کرے ہم اس کی آنکھ نکال دیں گے۔ ہماری قوت کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ جو ہمارے راستے میں آئے گا ہم اُسے کچل کر رکھ دیں گے۔

یہ تھی وہ قوم جس کے ہاتھوں مظلوم و مقہور انسانیت پر عرصۂ حیات تنگ ہو چکا تھا۔ جب ان کے مظالم انتہا تک پہنچ گئے تو ان کی طرف حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے۔ تاکہ انہیں اس روش سے باز رکھا جائے۔ انہوں نے آ کر ان سے کہا کہ تمہاری اس روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ تم اسے چھوڑ کر قوانینِ خداوندی

حضرت ہودؑ

کا اتباع کرو۔ اس کے جواب میں قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ (۷:۶۶) اس قوم کے اکابرین نے کہا۔ دیکھئے یہاں بھی وہی لفظ "الملاء" آیا ہے۔ یعنی وہ جنہیں سامانِ زیست بھرپور حاصل تھا۔ انہوں نے نشۂ قوت میں بدمست ہو کر کہا کہ میاں (معاذ اللہ) ہوش کے ناخن لو۔ کیا بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہو۔ یہ نظام جس کا نتیجہ دولت وحشمت اور قوت وشوکت کی اس قدر فراوانیاں ہیں، کبھی تباہی اور بربادی کی طرف نہیں لے جا سکتا۔ تم جاؤ اور اپنا کام کرو۔ قرآن کہتا ہے کہ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ۔ ان پر جذبات اس قدر غالب آ چکے تھے کہ انہیں کوئی شے اپنے اصلی رنگ میں دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔ انہیں اپنا سیاہ نامۂ اعمال بھی نہایت درخشندہ اور مزین نظر آتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ جب ذہنیت ایسی ہو جائے تو پھر کسی ناصح کی نصیحت کو کون سنتا ہے؟ انہوں نے حضرت ہودؑ کی نصیحت وموعظت سے اعراض برتا، تکذیب کی، سرکشی پر اتر آئے۔ اس کا نتیجہ تباہی تھا۔ اس تباہی کا نقشہ قرآن کریم نے بڑے عبرت انگیز انداز میں کھینچا ہے۔ کہا ہے کہ اے قوم مخاطب! تم جو اپنی قوت اور دولت پر اس قدر اترا رہے ہو گوشِ ہوش سے سنو کہ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ۔ ہم نے انہیں ایسا تمکن وتسلط عطا کیا تھا، وہ قوت وسطوت بخشی تھی جو تمہیں بھی حاصل نہیں۔ پھر یہ بھی نہیں کہ وہ لوگ جاہل تھے اس لئے اپنی جہالت کی وجہ سے تباہ ہو گئے۔ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْئِدَةً۔ انہیں دیکھنے سننے کی صلاحیت اور سمجھنے سوچنے کی اہلیت عطا کی تھی۔ وہ دیدہ ور اور باشعور تھے، صاحبِ علم وہنر تھے۔ لیکن فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ۔ لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی (مستقل اقدار سماوی سے اعراض برتا)، ان کے مطابق نظام قائم کرنے سے انکار کیا تو ان کا علم وہنر کسی کام نہ آیا۔ ان کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں سب بیکار ثابت ہوئیں۔ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۴۶:۲۶)۔ اور جس تباہی کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اس نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ سب کچھ دیکھتے بھالتے ہلاک ہو گئے۔ انہیں ان کے غلط نظام کے تباہ کن نتائج سے کوئی چیز نہ بچا سکی۔ اور یہ بات کچھ انہیں سے مخصوص نہیں وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ۔ (۴۶:۲۵)۔ ہر مجرم قوم کا انجام یہی ہوتا ہے۔ ان کی ہنرمندیاں انہیں اس تباہی سے بچا نہیں سکتیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

تدبر کی فسوں سازی سے قائم رہ نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہو

قومِ عاد کی سرگزشت سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آئی کہ خدا کے اٹل قانونِ مکافات کی رُو سے، وہ نظامِ زندگی جس میں دوسروں کی محنت کو لوٹا کھسوٹا جائے۔ جس میں کمزوروں اور ناتوانوں کو ہدفِ جور وستم بنایا جائے جس میں سلب ونہب اور (EXPLOITATION) قومِ غالب کا شعار ہو، وہ نظام کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ وہ نظام بھی نیست ونابود ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی حامل قوم بھی تباہ وبرباد۔ یہ خدا کا غیر متبدل قانون ہے، یہ اس کا اٹل فیصلہ ہے۔

اب آگے چلئے:

قومِ ثمود

قدیم زمانے میں، حجاز سے جو شاہراہ شام کو جاتی تھی، اس پر، وادیٔ قریٰ میں، ایک نامور قوم آباد تھی جو تاریخ میں ثمود کے نام سے متعارف ہے۔ زمانہ ان کا قریب اڑھائی ہزار سال قبل مسیح سے ڈیڑھ ہزار سال (ق۔م) کا بتایا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی تصریحات کے مطابق، اس قوم کو بھی بڑا تمکن حاصل تھا۔ (۷/۷۴)، پُر فضا باغات، لہلہاتی کھیتیاں، صاف اور شفاف پانی کے اُبلتے ہوئے چشمے، وہ میدانوں میں بڑے بڑے محلات تعمیر کرتے تھے اور پہاڑوں میں محکم قلعے بناتے تھے۔ (۱۵/۸۲، ۲۶/۱۴۶-۱۴۹)

قرآن کریم نے ان کا بنیادی جرم، اور ان کے نظام کی اساسی خرابی وہ بتائی ہے جسے خود ہمارے زمانے میں بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کی معیشت کا انحصار گلہ بانی پر تھا۔ وہ مویشی پالتے اور ریوڑ چراتے تھے۔ ظاہر ہے کہ گلہ بانی کے لئے وسیع و عریض چراگاہوں اور پانی کے چشموں کی ضرورت لاینفک ہے اور یہ کچھ انہیں فراوانی سے حاصل تھا۔ لیکن قرآن کہتا ہے، کہ وہ اس کے باوجود یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ (۲۶/۱۵۲)، ملک میں فساد برپا کرتے تھے۔ اس فساد کی تفصیل غور طلب ہے۔ سردارانِ قوم ان چراگاہوں اور چشموں پر اپنی ذاتی ملکیت جتا کر انہیں اپنے مویشیوں کے لئے مخصوص کر لیتے اور کمزور اور غریب لوگوں کے جانور بھوکے پیاسے رہتے ..... ان کی طرف حضرت صالحؑ خدا کا یہ انقلابی پیغام لے کر آئے کہ یہ چراگاہیں اور چشمے، ربوبیتِ عامہ کے لئے خدا کی طرف سے مفت ملتے ہیں، اس لئے انہیں تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ کسی انسان کو حق نہیں پہنچتا کہ زمین کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے کر دوسرے انسانوں اور ان کے مویشیوں کو رزق سے محروم کر دے۔ ظاہر ہے کہ اکابرینِ قوم اس انقلابی دعوت کو کیسے قبول کر لیتے؟ چنانچہ جیسا کہ ہونا چاہیئے تھا اور جیسا کہ ہوتا چلا آ رہا ہے، مظلوم اور نادار طبقے نے حضرت صالحؑ کی دعوت پر لبیک کہا اور سردارانِ قوم نے اس کی سخت مخالفت کی۔

معیشتِ گلہ بانی

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا مِنْ قَوْمِہٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْہُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّہٖ - (۷/۷۵) تکبر و نخوت کے نشہ میں مدہوش سردارانِ قوم ان لوگوں سے پوچھتے تھے جنہیں انہوں نے بے حد کمزور اور ناتواں بنا رکھا تھا اور جو حضرت صالحؑ کے ساتھ ہو گئے تھے کہ کیا تم واقعی دل سے یقین رکھتے ہو کہ صالحؑ خدا کا پیغمبر ہے۔ وہ جواب دیتے کہ ہم اسی لئے اس کے ساتھ ہو گئے ہیں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہتا ہے خدا کا پیغام ہے، ورنہ یہ بھی تو تم ہی میں سے ایک تھا۔ یہ اس قسم کی دعوت لے کر کیوں اٹھتا؟ ادھر سے ہٹ کر وہ خود صالحؑ سے مخاطب ہوتے اور کہتے کہ ہمیں تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ ۔ (۲۶/۱۵۳)، تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے جو اس طرح کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگ گئے ہو۔ ورنہ کوئی صاحب عقل و ہوش یہ کہہ سکتا ہے کہ ان زمینوں پر ہمارے حقوق مالکانہ سب ناجائز ہیں اور ان ناداروں کو جو اپنی روٹی تک کے لئے ہمارے محتاج ہیں، ان پر اسی طرح تصرف کا حق حاصل ہے جیسا ہمیں۔ ! اس سے تو معاشرہ میں انارکی پھیل جائے گی۔ ہم اس کی کبھی اجازت نہیں دیں گے۔ وہ اُن سے کہتے کہ یٰصٰلِحُ ۔ قَدْ کُنْتَ فِیْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ ھٰذَآ ۔ (۱۱/۶۲) تُو تو ہم میں سے بڑا عقلمند آدمی تھا، قبیلہ کا ممتاز رکن تھا۔ تجھ سے ہماری بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا کہ خود اپنے ہاتھوں ... اپنے قبیلہ کی دولت و حشمت کو برباد کر دینے کی سوچ رہے ہو! لیکن ظاہر ہے کہ خدا کے اس پیغامبرِ انقلاب پر ان باتوں کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی دعوت پر جمے رہے اور دوسری طرف سے مخالفت بڑھتی چلی گئی۔ اس مقام پر قرآن کریم

نے ایک عجیب نکتہ بیان کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت صالحؑ نے دیکھا کہ اس معاشرہ میں یہ خرابیاں عام ہو رہی ہیں، اور بات دو چار دس کی نہیں، یہاں تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے تو سوچا کہ ان کی اصلاح کس طرح ممکن ہوگی؟ ع سینہ تمام داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم — اس پر اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ بیشک قوم میں یہ خرابیاں عام ہیں، لیکن اس سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔

قوم کے سرغنے فساد کی جڑ ہوتے ہیں

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ۔ (۲۷/۴۸) مملکت کے مرکزی مقام میں صرف نو سرغنے (لیڈر) ہیں جو اس سارے فساد کی جڑ ہیں۔ وہی قوم کو صحیح راستے کی طرف نہیں آنے دیتے۔ ان کا بندوبست کر لو تو سارا معاملہ درست ہو جائے گا۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم دو لفظوں میں کتنی عظیم حقیقت کو بے نقاب کر گیا ہے۔ عوام نہیں بگڑتے۔ یہ چند خواص ہوتے ہیں جو اپنے مفاد کی خاطر ان میں بگاڑ پیدا کرتے اور انہیں فساد پر اکساتے رہتے ہیں!

بہرحال مخالفت اس حد تک بڑھ گئی کہ ان نو سرغنوں نے تہیہ کر لیا کہ حضرت صالحؑ کے مکان پر حملہ بول کر انہیں اور ان کے اہل کو قتل کر دیا جائے اور اس کے بعد ان کے وارثوں کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلا دیا جائے کہ ہمیں اس قتل کا کوئی علم نہیں۔ (۲۷/۴۹-۴۸) لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ سازش بھی ناکام رہ گئی اور حضرت صالحؑ نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ لوگ مجبوراً ان کے ساتھ مصالحت پر آمادہ ہو گئے۔ اب دیکھئے کہ اس مصالحت کی شرط کیا تھی۔

آپ نے اُن سے کہا کہ تم لوگ کہتے ہو کہ یہ مویشی ہمارے ہیں اور یہ زمینیں بھی ہماری ہیں؛ اس لئے ہمارے مویشی ہماری زمینوں میں ہی چگتے چریں گے۔ اس کے مقابل میں وہ اُن لوگوں کے مویشی ہیں جن کی یہ زمینیں نہیں۔ اس لئے وہ ان زمینوں میں نہیں آسکتے۔ یہ تمہاری بھول ہے اور اس کی بنیاد اس غلط نگہی پر ہے کہ تم نے جانوروں اور زمینوں کی نسبت انسانوں کی طرف کر رکھی ہے۔ اس لئے "میری اور تیری" کے پھیر میں پڑ گئے ہو۔ درحقیقت پوزیشن یہ ہے کہ یہ جانور سب خدا کی مخلوق ہیں — تمہارے بھی اور ان دوسرے لوگوں کے بھی — اور زمین ساری خدا کی ہے جسے اس نے اپنی مخلوق کے لئے ذریعۂ رزق بنایا ہے۔ لہٰذا، چراگاہیں سب مویشیوں کے لئے کھلی رہنی چاہئیں۔

انہوں نے کہا کہ ہمیں منظور ہے۔ آپ نے کہا کہ بہت اچھا، لیکن یہ ایک عملی مسئلہ ہے اس لئے اس کا ثبوت بھی عملی ہونا چاہیئے۔ وہ عملی ثبوت یہ ہے کہ یہ ایک اونٹنی ہے۔ اس کے متعلق یہ سمجھو کہ یہ نہ میری ہے نہ تیری۔ نہ زید کی ہے نہ عمر کی۔ یہ اللہ کی اونٹنی ہے اور یہ زمینیں بھی اللہ کی ہیں۔ اگر تم نے اس اونٹنی کو آزادانہ چرنے چگنے دیا تو سمجھ لیا جائے گا کہ تم اپنے معاہدہ کے پابند ہو۔ اور اگر اس کے راستے میں رکاوٹ ڈالی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اس سے منحرف ہو گئے ہو۔ قرآن کریم کے الفاظ میں — هَٰذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً ۖ فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ ...... (۷/۷۳)۔ یہ

خدا کی زمین خدا کی مخلوق کیلئے

ناقۃ اللہ ہے اور وہ ارض اللہ — ناقۃ اللہ، ارض اللہ میں چرے چگے گی۔ اللہ اللہ خیر سلا — آپ غور کیجئے، قرآن کریم نے ان چار الفاظ میں، اس اقتصادی مسئلہ کا حل کس جامعیت سے پیش کر دیا ہے جو تاریخ انسانیت میں سب سے زیادہ وجہ نزاع و فساد رہا ہے اور اب تک ہے۔ اس نے کہا یہ ہے کہ ذرائع رزق پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ انہیں تمام مخلوق کے لئے کھلا رہنا چاہیئے۔ حضرت صالحؑ نے، اپنے پیش نظر خاص وا قعہ کی نسبت سے ناقۃ اللہ کہا ہے حضور

نبی اکرمؐ نے اسے عالمگیر اصول قرار دینے کی جہت سے فرمایا کہ

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے۔ (ابوداؤد)

زمین بھی خدا کی اور بندے بھی خدا کے۔ اس لئے خدا کی زمین، خدا کے بندوں کے لئے کھلی رہنی چاہیئے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔

سردارانِ قومِ ثمود نے کرنے کو تو یہ معاہدہ کر لیا لیکن وہ اسے کس طرح برداشت کر سکتے تھے کہ وہ، اور قوم کا غریب طبقہ ایک سطح پر آجائیں۔ وہ جوشِ غضب میں پاگلوں کی طرح اُٹھے اور اس اونٹنی کو جو ان کے معاہدہ کی ٹھوس نشانی تھی، ہلاک کر دیا اور اپنے اسی سابقہ نظام پر بدستور بحال ہو گئے۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے باطل نظام کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

تباہی قرآن کریم نے اس تباہی کا نقشہ دو لفظوں میں اس طرح کھینچا ہے کہ اس سے عبرت و موعظت کی ساری تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اس نے کہا ہے۔ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰهَا۔ خدا نے اپنے قانونِ مکافات کی رُو سے، ان کے جرائم کی بنا پر، ان پر اس طرح روڈ رولر (ROAD ROLLER) پھیر دیا کہ سب اونچ نیچ برابر ہو گئی[1] اور اس کے بعد ہے۔ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا۔ (۹۱/۱۱-۱۵) خدا کا قانونِ مکافات جب ظالموں کو اپنی گرفت میں لیتا ہے تو اس کا ہاتھ نہیں کانپا کرتا۔ قانون کی محکمیت کا ثبوت ہی یہ ہے کہ وہ عواقب سے نہ ڈرے۔ عواقب سے ڈرنا مصلحت کوشی ہے اور مصلحت کوشی اور عدل، ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ اس کے بعد وہ رسولؐ اللہ کی قوم مخاطب سے کہتا ہے۔ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوْا۔ یہ ان کے گھر تمہارے سامنے موجود ہیں ویران، خالی، اُجڑے ہوئے۔ یہ اُن کے ظلم کا نتیجہ ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔ (۲۷/۵۰-۵۲) قومِ ثمود کی اس سرگزشت میں، اربابِ علم و بصیرت کے لئے، حقیقت تک پہنچنے کی بڑی روشن دلیل ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ

جو قوم، خدا کے عطا کردہ ذرائع رزق کو انسانوں کی ذاتی ملکیت قرار دیدے، وہ کبھی تباہی اور بربادی سے نہیں بچ سکتی، اس قسم کے نظام کا نتیجہ ہمیشہ ہلاکت ہوگا۔

حیاتِ آخرت سے انکار اسی سلسلہ میں قرآنِ کریم ایک اور عظیم حقیقت کو بھی سامنے لاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس قسم کا غلط نظام وہی قومیں اختیار اور رائج کرتی ہیں۔ جن کا نظریۂ حیات یہ ہو کہ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا۔ وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ۔ (۲۳/۳۷) زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے۔ موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حیاتِ آخرت اور اعمالِ انسانی کا محاسبہ سب افسانہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب انسان کا نظریۂ زندگی یہ ہو جائے تو پھر وہ کون سی چیز ہے جو اسے سلب و نہب، لوٹ کھسوٹ اور غصب و استحصال سے روک سکے۔ نظامِ سرمایہ داری اس تصورِ حیات کا فطری نتیجہ ہے۔ یا یہ تصورِ حیات اس نظام کا لازمی نتیجہ۔

اور یہی وجہ ہے کہ روس نے جب ایک طرف نظامِ سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی اور دوسری طرف حیاتِ آخرت سے

---

[1] چونکہ معاشرہ میں ناہمواریاں زمین کی بنا پر پیدا کی گئی تھیں۔ اس لئے قرآن نے تباہی کا استعارہ بھی زمین ہی کی شکل میں بیان کیا ہے۔

انکار کیا تو علامہ اقبالؒ نے اسے وارننگ دی کہ یاد رکھو۔ جس نظام کی طرف تم دعوت دیتے ہو، وہ اس تصورِ حیات کیساتھ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس نظام کی بنیاد وہی ایمان بالآخرت ہے۔ یہ عمارت اسی بنیاد پر قائم رہ سکتی ہے۔

اے کہ می جوئی نظامِ عالمے — جُستۂ او را اساسِ محکمے

تم جو ایک عالمگیر نظام کی آرزو لے کر اُٹھے ہو کیا تم نے اس کے لئے کسی محکم بنیاد کو بھی تلاش کر لیا ہے۔

اب آگے بڑھیئے اور قومِ مدین کی طرف آجایئے۔

(٥)

قومِ مدین

حضرت ابراہیمؑ کے ایک بیٹے کا نام مدین تھا۔ اس کی نسل تاریخ کے صفحات پر قومِ مدین کے نام سے متعارف ہوئی۔ یہ قوم حجاز کے شمال میں، شام سے متصل علاقے میں سکونت پذیر تھی۔ حضرت شعیبؑ اس قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے جن کا زمانہ قریب ۱۶۰۰ (ق۔م) قیاس کیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی تصریحات کے مطابق، یہ قوم تجارت پیشہ تھی۔ اور اس شعبہ میں انہوں نے بڑی ترقی حاصل کر رکھی تھی۔ لیکن ہر سرمایہ پرست تجارت پیشہ قوم کی طرح ان کا انداز بھی یہ تھا کہ

سرمایہ پرستوں کا نظامِ تجارت

وہ "لیتے زیادہ تھے اور دیتے کم تھے۔" ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ایک طرف محنت کش کے خون کا آخری قطرہ تک بھی نچوڑ لیں اور دوسری طرف ہر حیلہ کاری اور فریب دہی سے گاہک کی جیب بھی کاٹ لی جائے۔ قومِ ثمود میں اگر نظامِ سرمایہ داری کا عفریت زمینداری کی شکل میں نکلا تھا، تو قومِ مدین میں، وہ سوداگری کے پیراہن میں پائے زن۔ یہ تھی وہ قوم جس کی طرف، آسمانی انقلاب کے پیامبر حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے۔ قرآنِ کریم نے ان کے تذکارِ جلیلہ کا آغاز ایک عمیق، بصیرت افروز نکتہ سے کیا ہے۔ حضرت شعیبؑ نے جب اپنی دعوت کا آغاز کیا تو ان کی قوم نے سمجھا کہ یہ خدا پرست انسان، لوگوں کو الشور کی بھگتی اور پوجا پاٹ کی تلقین کرتا ہے، سو یہ بات قابلِ اعتراض نہیں، اس لئے اسے اس کی اجازت دے دینی چاہیئے۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ یہ شخص ان کے کاروباری معاملات میں بھی دخل اندازی کرنے لگ گیا ہے۔ کبھی ان سے کہتا ہے کہ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ۔ دیکھو! اپنے ماپ اور تول کے پیمانے کم نہ رکھو۔ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ — ٹھیک ٹھیک ماپو۔ صحیح صحیح تولو۔ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ (۱۱/۸۴-۸۵) گاہک کو اس کی ادا کردہ قیمت کے مطابق چیز دو۔ نہ اس میں کمی کرو نہ ملاوٹ۔ اور کبھی ان سے کہتا ہے کہ لَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ۔ ایسا نہ کرو کہ مختلف شاہراہوں پر راہزن بن کر بیٹھ جاؤ۔ یا ڈروں پر جا کر سمگلنگ کرو۔ اور تَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا۔ (۷/۸۶)۔ اور جو دیانتدار انسان تمہیں اس روش سے روکے، اسے ڈرانے دھمکانے لگ جاؤ۔ اور اس طرح معاشرے میں ناہمواریاں اور پیچیدگیاں پیدا کرتے چلے جاؤ۔ اس پر وہ لوگ بڑے متعجب ہوئے اور حضرت شعیبؑ سے کہنے لگے کہ تم نے ہم سے صلوٰۃ کی اجازت مانگی تھی اور ہم نے اس کی یہ سمجھ کر اجازت

یہ صلوٰۃ کیسی ہے؟

دے دی تھی کہ تم اگر اپنے طریق پر خدا کی پرستش کر لیا کرو تو اس پر ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن يَا شُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ ..... أَن نَّفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا

مَا نَشٰٓؤُا ۔ (۱۱/۸۷)، تمہاری یہ صلوٰۃ کس قسم کی ہے جو تمہیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے مال کو اپنی مرضی کے مطابق صرف میں لا سکیں۔ نماز کو معاشی نظام سے کیا واسطہ! نماز کا تعلق مذہب سے ہے، معاشیات کا تعلق امورِ دنیا سے ..... یہ تمہارا مذہب کس قسم کا ہے جس کا دائرہ معاشیات تک کو بھی محیط ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ سیکولر نظامِ زندگی کا تصور کچھ عصرِ حاضر کی ایجاد نہیں۔ دین اور مذہب کا یہ فرق شروع سے چلا آرہا ہے۔ اربابِ سیاست و معاشیات کو اس سے کچھ تعرض نہیں ہوتا کہ لوگ مذہبی عقائد کس قسم کے رکھتے ہیں۔ اور پرستش اور پوجا پاٹ کس طور طریق سے کرتے ہیں۔ یہ مذہب کی دنیا ہے جس کی وہ پوری پوری آزادی دے دیتے ہیں۔ لیکن وہ اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ مذہب، دنیاوی معاملات میں بھی دخل اندازی کرے۔ (اسے دین کہتے ہیں)۔ قومِ شعیبؑ کا تصورِ زندگی بھی سیکولر انداز کا تھا۔ اسی لئے وہ حضرت شعیبؑ کی اس دعوت پر متعجب و معترض تھے جس کی بنیاد دین پر تھی۔

اس مقام پر ایک اور حقیقت بھی سامنے آتی ہے۔ حضرات انبیاء کرامؑ عام طور پر ممتاز گھرانوں کے افراد ہوتے تھے۔ اس لئے جب وہ اس روش کی مخالفت کرتے تھے جو خود ان کے اپنے گھرانے اور اسی جیسے دوسرے گھرانوں میں متوارث چلی آتی تھی، تو غیر تو ایک طرف، خود اپنوں کو بھی ان پر تعجب ہوتا تھا کہ یہ عجیب پاگل ہے جو اپنے گھر کی دولت و حشمت اور شرف و عزت سے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ رہا ہے۔ حضرت شعیبؑ بھی ایک ذی اثر گھرانے کے فرد تھے۔ اسی لئے قوم کے اکابرین نے ان سے کہا کہ لَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۔ (۱۱/۹۱)، اگر ہمیں تمہارے خاندان اور برادری کا پاس نہ ہوتا تو ہم تمہیں کبھی کا سنگسار کر چکے ہوتے۔ اس کے جواب میں حضرت شعیبؑ نے فرمایا کہ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ (۱۱/۹۲)، تم عجیب لوگ ہو جنہیں خدا کے قانونِ مکافات کا تو کچھ ڈر نہیں لیکن میری برادری کا پاس اس سے بھی زیادہ ہے۔

ادھر سے ہٹ کر انہوں نے اُن لوگوں کو ڈرانا دھمکانا شروع کیا جنہوں نے حضرت شعیبؑ کی دعوت پر لبیک کہا تھا۔ یہ غریب لوگ تھے اور ان کی برادریاں بھی طاقتور اور ذی اثر نہیں تھیں۔ ان اَلْمَلَاُ الْقَوْم نے ان سے کہا کہ تم اس انقلابی شخص کا ساتھ چھوڑ دو، ورنہ نقصان اٹھاؤ گے (۷/۹۰)، لیکن انہوں نے بھی ان کی ایک نہ مانی۔

بہرحال، انہوں نے اپنے نظام کو نہ بدلا۔ تا آنکہ وہ (قرآن کے الفاظ میں) اس طرح ان کے اوپر آ کر گرا کہ وہ اس کے بوجھ تلے دب کر رہ گئے اور ان کے گھر اس طرح اُجڑ گئے کَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا (۱۱/۹۵)، گویا وہ ان میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔

یہ تھا انجام اس نظامِ معیشت کا جس میں تجارت، خون آشامی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ تجارت کا تعلق شہری معیشت سے ہوتا ہے۔ جہاں تک ان کی دیہاتی زندگی کا تعلق ہے، وہاں وہی زمینداری نظام رائج تھا جسے ہم قومِ ثمود کے ہاں دیکھ آئے ہیں۔ اس کی ایک جھلک ہمارے سامنے قصۂ صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسےٰؑ میں آتی ہے۔

مدین کا پیاؤ

جب حضرت موسےٰؑ (زمانہ قبل از نبوت میں)، فرعون کے پنجۂ استبداد سے بچنے کی خاطر مصر سے بھاگے ہیں تو مدین کے علاقہ میں سرِراہے ایک پیاؤ کے قریب آکر، درختوں کے سایہ میں سستانے کے لئے بیٹھ گئے۔ وہ دیکھتے کیا ہیں کہ سامنے پیاؤ پر اوروں کے مویشی پانی پی کر چلے جا رہے ہیں لیکن دو لڑکیاں ہیں جن کی بھیڑیں پیاس کی شدت سے پیاؤ کی طرف دوڑ دوڑ کر جانا چاہتی ہیں لیکن وہ لڑکیاں انہیں آگے بڑھنے سے روک رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر حضرت موسےٰؑ سے نہ رہا گیا اور ان لڑکیوں سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ تم اپنی پیاسی بھیڑوں کو اس طرح روک کیوں رہی ہو؟ انہوں نے

نے کہا کہ ان مویشیوں کے چرواہے زور آور ہیں اور ہماری حالت یہ کہ گھر میں کوئی مرد نہیں بجز ایک باپ کے جو بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس لئے جب تک یہ چرواہے اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر چلے نہیں جاتے، ہم اپنی بھیڑوں کو کیسے آگے بڑھنے دے سکتی ہیں۔ یہ سن کر حضرت موسےٰ نے ایک سرد آہ بھری اور کہا کہ ---- بہر زمینے کہ رفتیم آسماں پیداست ---- ارضِ فرعون سے بھاگا تھا کہ وہاں کمزوروں اور غریبوں پر طرح طرح کے مظالم ہوتے ہیں۔ یہاں آیا ہوں تو یہاں بھی کمزوروں اور بے کسوں کی وہی حالت ہے۔ یہ کہہ کر اٹھے۔ آگے بڑھ کر ان کی بھیڑوں کو پانی پلایا اور پھر درختوں کے نیچے آکر بیٹھ گئے اور بحضور رب العزت عرض کی کہ:-

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے!

یہ تھی قوم مدین کی دیہاتی زندگی، اور وہ تھی اُن کی شہری زندگی۔ ظاہر ہے کہ وہ تباہ نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا؟

قومِ لُوط

اس وقت تک جن اقوام کی سرگزشت ہمارے سامنے آئی ہے وہ اپنے غلط سیاسی یا معاشی نظام کی وجہ سے تباہ ہوئیں۔ اب ہمارے سامنے ایک ایسی قوم آتی ہے جس کا جرم خود ان کے نام کے اندر مضمر ہے۔ یہ ہے قومِ لوطؑ جس کی نسبت سے لواطت کی نہایت مکروہ اصطلاح وجود میں آئی۔ ان کے مرکزی مقام کا نام سدوم تھا جسے انگریزی میں (SODOM) لکھتے ہیں۔ (SODOMY) کے لفظ کی نسبت اسی کی طرف ہے۔

قرآن کریم عصمت کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور اس کا شمار مستقل اقدار میں کرتا ہے۔ ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ عصمت خاصۂ انسانیت ہے۔ حیوانوں میں اس کا تصور نہیں ہوتا۔ لہٰذا، جسے عصمت کا احساس نہ رہے وہ انسانی سطح سے گر کر حیوانی سطح پر پہنچ جاتا ہے۔ اور جب جنسی جذبہ کی تسکین بدنہادی (PERVERSION) تک پہنچ جائے تو وہ مقام "بَلْ هُمْ اَضَلُّ" کا ہوتا ہے۔ یعنی حیوانوں سے بھی زیادہ پست سطح۔ کیونکہ حیوانوں میں (SEX- PERVERSION) نہیں ہوتی۔ یہ جرم انفرادی طور پر بھی کچھ کم شرمناک نہیں ہوتا لیکن جب یہ کسی معاشرہ کا عام معمول بن جائے تو اسے انسانی معاشرہ کہا ہی نہیں جا سکتا۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک جب قومِ لوط کی سرگزشت ہمارے سامنے آتی تھی تو ہم حیران رہ جاتے تھے کہ وہ قوم، پوری کی پوری، اس قسم کی شنیع حرکت کی مرتکب کیسے ہو گئی۔ لیکن اب یہ بات چنداں وجہ حیرت نہیں رہی۔ قومِ لوط کی سرگزشت تو آج سے چار ہزار سال پہلے کے دورِ جہالت سے متعلق ہے۔ آج اس بیسویں صدی کے زمانۂ علم و بصیرت میں

دورِ حاضرہ کی حالت

دنیا کی سب سے بڑی مہذب اور متمدن قوم برطانیہ نے .... وہ قانون پاس کیا ہے جس کی رُو سے لواطت (HOMO - SEXUALITY) کو جرائم کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے۔ سچ کہا تھا قرآن نے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ (۵ۓ۹۵) ہم نے تو انسان کو حسین ترین ہیئت میں پیدا کیا تھا۔ لیکن یہ کمبخت، اپنی حرکات سے اپنے آپ کو پست سے پست سطح پر لے جاتا ہے۔

---

* امریکہ سے بھی اس قسم کی اطلاعات موصول ہو رہی ہیں کہ وہاں لڑکوں (غلام) کی باقاعدہ خرید و فروخت ہوتی ہے۔

اُس قوم کی بے حیائی اور سرکشی کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت لوطؑ نے انہیں اس انسانیت سوز فعل سے باز رہنے کی تلقین کی تو بجائے اس کے کہ انہیں اس پر کچھ ندامت ہوتی، وہ آپس میں کہنے لگے کہ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۔ (۷/۸۲)، "یہ لوگ اپنے آپ کو بڑا مقدس اور پاک باز سمجھتے ہیں۔ انہیں بستی سے نکال باہر کرو" اس پوری قوم کی طرف سے اس قسم کی باتیں سن کر حضرت لوط محو حیرت رہ جاتے تھے اور انتہائی تعجب اور تاسف سے کہتے تھے کہ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۔ (۱۱/۷۸) کیا تم میں کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں جو ذرا سوجھ بوجھ سے کام لے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ وبا اس قدر عام ہو چکی تھی کہ اس کے ہلاکت آفرین جراثیم سے قوم کا کوئی متنفس بھی محفوظ نہیں رہا تھا اور ظاہر ہے کہ جب کسی قوم میں جرائم اس درجہ عام ہو جائیں تو اس کی تباہی میں کون سی کسر باقی رہ سکتی ہے۔ چنانچہ وہ قوم تباہ ہو گئی اور اس طرح تباہ ہوئی کہ جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا ۔ (۱۱/۸۲)، اس کی بلندیاں پستیوں میں بدل گئیں۔ ..... بحر میت (DEAD SEA) کا مہیب اور لرزہ فگن ماحول اور اس میں بکھرے ہوئے کھنڈرات کی ویرانیاں، آج بھی اس سوختہ بخت قوم کے عبرت انگیز انجام کے مرثیہ خواں ہیں۔

اقوامِ مغرب کی عریاں اور آبرو باختہ تہذیب سے متاثر ذہنیتوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جنسی جذبہ کی تسکین کا، قوموں کی موت وحیات سے کیا واسطہ! ان لوگوں کو وحی کی سند سے کچھ سمجھانا بے کار ہے۔ وہ اسے سند مانتے ہی نہیں۔ لیکن مغربی محققین کو تو یہ سند تسلیم کرتے ہیں۔ ہم ان سے کہیں گے کہ وہ ان محققین سے پوچھ لیں کہ ان کی تحقیق اس باب میں کیا کہتی ہے۔ زیادہ نہیں تو وہ کیمبرج یونیورسٹی کے ریسرچ سکالر ڈاکٹر (J.D. UNWIN) کی کتاب (SEX & CULTURE) اٹھا کر دیکھ لیں جسے انہوں نے اسی غیر مہذب قدیم قبائل، اور سولہ مہذب اقوام کی جنسی زندگی کے مطالعہ کے بعد مرتب کیا ہے۔ وہ اپنی تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ

> اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہو گئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہو گا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا۔ (صفحہ ۲۰۳)

اور اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ

> جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد (یعنی قریب سو سال میں) نمودار ہوتے ہیں (صفحہ ۳۳)

لہٰذا جنسی ضوابط سے بیباک ہو جانے والا معاشرہ اگر سمجھتا ہے کہ اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا تو اسے اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے۔ اس کا آخری نتیجہ قومی تباہی کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتا۔[1]

(۰)

قومِ فرعون

اس کے بعد ہمارے سامنے وہ قوم آتی ہے جس کے جرائم کی فہرست طول طویل ہے۔ لیکن قرآن کریم نے انہیں تین اصولی اور

---

[1] اس کی تفصیل "سلیم کے نام خطوط" کی تیسری جلد میں ملے گی۔

اساسی شقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یعنی استبدادِ ملوکیت کی قہر سامانیاں جن کا مجسمہ فرعون تھا۔ مذہبی پیشوائیت کی دسیسہ کاریاں جن کا پیکر ہامان تھا اور نظامِ سرمایہ داری کی خون آشامیاں جن کا نمائندہ قارون تھا۔ یہ تینوں یکجا، اور ان کے آہنی پنجے میں گرفتار قومِ بنی اسرائیل کی شکل میں، تڑپتی، پھڑکتی انسانیت۔ دوسری طرف قرآن کریم نے ان تینوں گوشوں کے جرائم کا تذکرہ اس شرح و بسط سے کیا ہے کہ میری تصنیف، برقِ طور، کے قریب اڑھائی سو صفحات بمشکل انہیں اپنے دامن میں سمیٹ سکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قدر تفصیل کو اس قدر مختصر وسعت میں سمیٹنا ناممکن ہے اس لئے ان کے سرسری تذکرہ پر اکتفا کیا جائے گا۔

پارٹی بازی

جیسا کہ نظامِ ملوکیت کا خاصا ہے، فرعون نے قومِ بنی اسرائیل کو اپنا محکوم بنا رکھا تھا اور انہیں طرح طرح کے عذاب دیتا تھا۔ وہ اس ڈر سے کہ بنی اسرائیل کہیں ایک مرکز پر جمع ہو کر اس کے لئے خطرہ کا موجب نہ بن جائیں، کرتا یہ تھا کہ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ (۲۸/۴)، ان میں پارٹیاں بناتا رہتا اور اس طرح انہیں آپس میں لڑا کر ان کی قوت کو کمزور کرتا رہتا۔ پھر اس کی چال یہ تھی کہ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ (۲۸/۴)، وہ اس قومِ محکوم کے جن افراد میں جوہرِ مردانگی کے آثار دیکھتا، انہیں کچل دیتا اور ان سے عاری طبقے کو اپنا مقرب بناتا اور آگے بڑھاتا رہتا۔ اس نے رزق کے سب چشمے اپنے قبضے میں کر رکھے تھے اس لئے یہ مظلوم و محکوم قوم، نانِ شبینہ تک کے لئے اس کی محتاج تھی۔ اسی لئے اس نے جب ان میں ذرا سی سرکشی کے آثار دیکھے تو گرج کر کہا کہ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ (۴۳/۵۱)۔ تم جانتے نہیں کہ یہ ملک میرا ہے۔ اس میں بہنے والی نہریں میرے قبضے میں ہیں۔ میں تمہیں بھوکا مار دوں گا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (۷۹/۲۴)۔ میں تمہارا پالن ہار ہوں اس لئے مجھے حق حاصل ہے کہ تم پر حکومت کروں۔ جو جنہیں روزی دیتا ہے وہی ان کا آقا اور خدا ہوتا ہے۔

اَن داتا

آپ دیکھتے ہیں کہ اس ذہنیت سے کس طرح تمرد و نخوت کے شعلے اٹھتے اور سرکشی اور انانیت کے طوفان اٹھتے ہیں۔

یہ تھا وہ فرعون جس کی طرف حضرت موسیٰؑ کو یہ کہہ کر بھیجا گیا کہ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۲۰/۲۴)، فرعون کی طرف جاؤ۔ اس نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی ہے۔ اس کی سرکشی حدود و فراموش ہو گئی ہے۔ دوسرے مقام پر ہے۔ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا۔ وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ۔ (۲۳/۴۵-۴۶) "جاؤ فرعون اور اس کے ارکینِ مملکت اور سردارانِ قوم کی طرف جو تکبر و نخوت کے پیکر ہیں"۔ قرآن کریم نے اس قوم کو کہیں مجرمین کہا ہے کہیں ظالمین۔ کہیں مفسدین کہا ہے کہیں فاسقین۔ یعنی ظلم و استبداد اور سرکشی و حدود و فراموشی کے جس قدر جرائم ہو سکتے تھے۔ وہ سب ان میں موجود تھے۔

حضرت موسیٰؑ فرعون کی طرف آتے اور اس سے کہا کہ میں خدائے رب العالمین کا پیغامبر ہوں اور تم سے صرف اتنا مطالبہ کرنے کے لئے آیا ہوں کہ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۲۶/۱۷)، بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو۔ دوسرے مقام پر جو الفاظ آئے ہیں وہ اس پیغمبرانہ مشن کی اور بھی زیادہ وضاحت کرتے ہیں۔ آپ نے اس سے کہا کہ میں اس لئے آیا ہوں۔ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ (۴۴/۱۸)، کہ خدا کے بندوں کو میرے حوالے کر دے کہ میں انہیں خدا کی زمین میں لے جاؤں جہاں وہ خدا کے سوا کسی کے نہ ہوں۔ حضرت موسیٰؑ نے یہاں عبادَ اللہ کہہ کر ساری بات واضح کر دی۔ یعنی کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے کو اپنے فیصلوں کا محکوم بنائے۔ انسان صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے اپنے جیسے انسانوں

کا غلام بننے کے لئے نہیں۔

آپ نے دیکھا کہ حضرت موسیٰؑ کا مطالبہ کس قدر صاف، سیدھا اور مبنی برحق و انصاف تھا۔ انہوں نے نہ فرعون سے اسکی بادشاہت چھین لینے کا مطالبہ کیا تھا، نہ اس کی حکومت میں شریک ہونے کا دعویٰ۔ کہا صرف یہ تھا کہ اس مظلوم قوم کو اجازت دیدو کہ یہ کسی اور خطۂ زمین کی طرف چلی جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر ایک قوم غالب اپنے ہاں کی اقلیت کو وہاں سے چلے جانے کی اجازت دے دے تو وہ پھر حکومت کس پر کرے؟ (ضمناً، یہ بعینہٖ وہی پوزیشن تھی جو تقسیم ہند سے پہلے ہمارے اور ہندوؤں میں بنائے نزاع تھی۔ ہندو بھی اسی لئے ہماری علیحدگی پر راضی نہیں ہوتا تھا کہ اگر مسلمان وہاں سے چلے گئے تو وہ حکومت کس پر کرے گا)

فرعون نے اس مطالبہ کی مخالفت کی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی پوزیشن وہاں بڑی مؤثر اور حضرت موسیٰؑ کا مقام خاصا بلند تھا۔ اسی لئے فرعون ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس کی بجائے اس نے سیاستِ ملوکانہ سے کام نکالنا چاہا۔ اس نے پہلے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اپنے دیرینہ روابط کا تذکرہ کیا اور کہا کہ ہم نے تم پر اس قدر احسانات کئے اور تم اس کا بدلہ اس طرح دے رہے ہو! آپ کو معلوم ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس کا کیا جواب دیا۔ آپ نے کہا کہ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدتَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ (۲۶/۲۲)، تم نے مجھ پر جو ذاتی احسانات کئے، ان کی یاد تو دلاتے ہو لیکن اپنے اس سب سے بڑے "احسان" کی یاد کیوں نہیں دلاتے کہ تم نے پوری کی پوری قوم بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے! تم مجھ سے سودا کرنا چاہتے ہو کہ مجھ پر ذاتی نوازشات کی قیمت میں بنی اسرائیل کی آزادی خرید لو۔

برو، ایں دام برِ مرغِ دگر نِہ   کہ عنقا را بلند است آشیانہ

احسانات کی یاد دہانی

جب وہ اپنے اس حربے میں ناکام رہا تو اس نے پھر وہ تدبیر اختیار کی جو حکمتِ فرعونی کا آخری حربہ ہوتی ہے۔ یعنی اس نے جھوٹے پراپیگنڈہ سے عوام کو برانگیختہ کرنا چاہا کہ وہ بنی اسرائیل کے خلاف ہنگامہ آرائیاں شروع کر دیں۔ قرآن کریم میں ہے۔ قَالَ لِلْمَلَإِ حَوْلَهُ إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ. يُرِيدُ أَن يُخْرِجَكُم مِّنْ أَرْضِكُم بِسِحْرِهِ. فَمَاذَا تَأْمُرُونَ (۲۶/۳۴-۳۵)، فرعون نے اپنے اراکینِ مملکت سے کہا کہ یہ شخص بہت بڑا فریب کار نظر آتا ہے۔ مطالبہ تو بظاہر یہ کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کو یہاں سے لے جائے لیکن درحقیقت اس کا پلان یہ ہے کہ تمہیں اس مملکت سے نکال باہر کرے اور خود حکمران بن بیٹھے۔ کہو! اس فتنے کو فرو کرنے کے سلسلہ میں تمہارا کیا مشورہ ہے؟

مذہبی پیشوائیت

اراکینِ مملکت نے کہا کہ اس کے خلاف اس قسم کا پراپیگنڈہ کارگر نہیں ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ اسے جذباتی مسئلہ بنا دیا جائے اور اسے مذہبی پیشوائیت کے ساتھ ٹکرا کر عوام کو اشتعال دلایا جائے کہ یہ شخص اپنا مذہب تم پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ فرعون اور اس کے اراکین کے بجائے ہامان اور اس کے جنود (مذہبی لشکروں) کے ساتھ شروع ہوتا ہے جو (قرآن کے استعارے کے مطابق) رسیوں کے سانپ بنا بنا کر عوام کو فریب دیتے تھے۔ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ کیا ہوتا ہے، اور ان خدائی فوجداروں کے پیشِ نظر مقاصد کیا ہوتے ہیں، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ وہ آتے تو ہیں اپنے مذہب کی حقانیت اور فوقیت ثابت کرنے کے لئے، لیکن بادشاہ سے پہلے معاملہ طے کرتے ہیں کہ ہم اگر کامیاب ہو گئے تو ہمیں ملے گا کیا؟ اور بادشاہ انہیں یہ لالچ دیتا ہے کہ ان کا شمار بادشاہ کے مقربین میں ہو جائے گا۔ دوسری طرف ان لوگوں کی منافقت کا یہ عالم تھا کہ قرآن کریم کے

بیان کے مطابق، وہ دل سے اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ موسیٰؑ کا دعویٰ حق و صداقت پر مبنی ہے لیکن ان کا پندارِ نفس انہیں اس حقیقت کے اعتراف کی طرف آنے نہیں دیتا تھا۔ (۲۷/۱۴)

لیکن ان میں کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی تھے جنہوں نے اس اعتراف کی جرأت کر لی اور اعلان کر دیا کہ موسیٰ کا دعویٰ سچا ہے۔ اس پر جس طرح فرعون گرجا اور برسا ہے، قرآن کریم نے مختلف مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے لیکن (بغرضِ اختصار) اس سلسلہ میں صرف ایک نکتہ کو سامنے لایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ فرعون نے ان سے کہا کہ اٰمَنۡتُمۡ لَہٗ قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَکُمۡ (۲۰/۷۱) "تم نے میری اجازت کے بغیر ہی اپنے عقیدہ میں تبدیلی کر لی۔ اب دیکھو میں تمہارے کس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر کے تمہیں صلیب پر لٹکاتا ہوں"۔ اس سے ظاہر ہے کہ استبداد ملوکیت، آزادیٔ خیال و عقاید کی اجازت نہیں دیتا۔ اس میں تبدیلیٔ عقیدہ (ارتداد) کی سزا موت ہوتی ہے۔

یہ تھا ملوکیت کے استبداد اور مذہبی پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کا گٹھ جوڑ۔ باقی رہا قارون، سو اس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ وہ خود قومِ موسیٰؑ میں سے تھا۔ یعنی بنی اسرائیل ایک طرف تو غیر قوم (قومِ فرعون) کے پنجۂ استبداد میں جکڑی ہوئی تھی اور دوسری طرف، خود اپنے ہاں کا سرمایہ دار طبقہ ان کا خون چوس رہا تھا۔

قارون

ظاہر ہے کہ جس نظام میں دسیسہ کاریٔ ملوکیت، الجہ فریبیٔ مذہبی پیشوائیت اور خون آشامیٔ سرمایہ پرستی اس حد تک پہنچی ہو، وہ نظام، اس قوم کو لے کر ڈوبے گا نہیں تو اور کیا ہو گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور نُرِیَ فِرۡعَوۡنَ وَ ہَامٰنَ وَ جُنُوۡدَہُمَا مَا کَانُوۡا یَحۡذَرُوۡنَ (۲۸/۶)، فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں نے اپنی آنکھوں سے اپنا وہ انجام دیکھ لیا جس سے وہ اس قدر خائف تھے۔ اور بنی اسرائیل نے آزادی کی فضا میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

(باقی آئندہ)

بقیہ: ... انسانیت ...... (صفحہ ۸ سے آگے)

قرآن کہتا ہے کہ نکاح کے وقت مرد پر عورت کو مہر دینا فرض ہے۔ مرد کہتا ہے کہ مہر تو ادا ہوتا رہے گا، اس کی بات چھوڑ دو۔ بات تو یہ کرو کہ ہونے والی بیوی ہمارے مطالبات کی دی ہوئی لسٹ کے مطابق اپنے ساتھ جہیز لا رہی ہے یا نہیں؟ اگر جہیز نہیں تو نکاح نہیں ہو گا۔ اپنے معاشرے پر نگاہ ڈالیے۔ کیا یہاں بھی روش جاری و ساری نہیں؟ جو والدین بیٹی کو لاکھوں کا جہیز دینے کی استطاعت رکھتے ہیں وہ اس کی شادی کرنے کا بھی حق رکھتے ہیں۔ جو بیٹی کو جہیز نہیں دے سکتے ان کی بیٹی شادی کرنے کا حق نہیں رکھتی۔ جہیز کے بغیر یا مختصر جہیز لے جانے والی بیوی نہ میاں کی نظروں میں اپنا کوئی مقام رکھتی ہے نہ میاں کے خاندان میں کوئی عزت باقی ہے۔ پھر وہ مظلومی اور بے بسی کی بے جان تصویر بن جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ غالب اور بالادست مرد کے سامنے مفتوح اور زیردست عورت کر ہی کیا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو مرد و عورت کے تعلق کے حوالے سے یہ فرمایا کہ ہُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لِبَاسٌ لَّہُنَّ ...... "تم ایک دوسرے کے بمنزلہ لباس کے ہو، جو بدن کے ساتھ پوری طرح موافقت رکھتا ہے"۔ یعنی مرد اور عورت کی باہمی رفاقت سے ایک دوسرے کی صلاحیتیں نشوونما پاتی اور توازن پذیر ہوتی ہیں۔ لیکن مرد کی حالت یہ ہے کہ دورِ جاہلیت

میں تو اپنی افضلیت کے فریب میں مبتلا تھا ہی، علم و روشنی کے زمانے میں بھی اس فریب خوردگی سے نہیں نکل سکا۔ ماضی میں بھی اپنے رفیقِ حیات کو اپنے برابر نہ سمجھا۔ حال میں بھی یہ برابری گوارا نہیں۔ ایسے ماضی اور حال کے بعد عورت کا مستقبل کیا ہو سکتا ہے!

حیا و عصمت تمدنی زندگی کی وہ عظیم قدر ہے جس کی حفاظت کی تاکید قرآن کریم میں مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے یکساں آئی ہے۔ مرد اور عورت کی عظمت کے لئے عصمت کا تحفظ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن "اسلام کے اجارہ دار" مردوں کے نزدیک یہ بنیادی قدر بھی صرف عورتوں سے متعلق ہوتی ہے۔ مردوں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کی خلاف ورزی سے ان کی ذات پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ رسوائی صرف عورت کا مقدر بنتی ہے۔ گردن زدنی صرف عورت کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ یہی ہوتا چلا آرہا ہے اور انتہائے غضب یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی موجودگی میں اس کی تلاوت کرنے کے بعد بھی یہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس موقعہ پر مجھے یاد آیا، ایک درسِ قرآن میں مفکرِ قرآن نے فرمایا تھا کہ عصمت وہ قدر ہے جس کی حفاظت کے پہلے ذمہ دار مرد ہیں۔ اگر وہ اپنی عصمت کی حفاظت کریں تو عورتوں کی عصمت خود بخود محفوظ ہو جائے گی۔ کیسی سچی اور کھری بات کہی ہے؟

ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ سرورِ کائنات حضور رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآنی معاشرہ کا منتہیٰ یہ بتایا تھا کہ اس میں ایک عورت یمن سے شام تک تنہا سفر کرے گی اور اسے کسی قسم کا خوف و خطر نہ ہوگا۔ یعنی حسین معاشرہ کی پہچان ہی یہ ہے کہ اس میں عورت کسی وقت کسی جگہ بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس نہ کرے۔ جس معاشرے میں عورت اپنے آپ کو محفوظ تصور نہیں کرتی اس معاشرہ کا توازن قائم ہی نہیں رہ سکتا۔

میں ایک فقرہ پھر دُہرا دوں کہ

قرآن اجتماعی نوعِ انسان کو واجب التکریم بتاتا ہے تو اس میں مرد عورت دونوں شامل ہوتے ہیں۔ اگر ہم انسانوں کی آدھی آبادی سے نفرت کریں گے تو ہمارا یہ طرزِ عمل باقی آدھی آبادی کو واجب العزت نہیں بنا دے گا، اس لئے کہ ایک آنکھ دکھتی ہو تو دوسری آنکھ کبھی چین سے نہیں سو سکتی۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے۔ ربّ العالمین نے مرد عورت دونوں کو آزاد پیدا کیا ہے لیکن یہ آزادی اسی صورت میں صحیح اور سچی ہوتی اور قائم رہتی ہے جب اسے خدا کی کتاب کی حدود و اقدار کا پابند رکھا جائے۔

یہ حقائق ایسے ہیں جن کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ مگر کیا اس سوال کا جواب ہمارے پاس ہے کہ ہمارے قدم کب اس صراطِ مستقیم پر اٹھیں گے؟ ہمارے ضمیر سے کب یہ آواز اٹھے گی کہ ہم قرآن پر ایمان رکھنے کے مدعی ہونے کے باوجود کب تک اس کے خلاف چلتے رہیں گے؟ سوچئے کہ یہ سوچنے کی بات ہے!

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جسے مقامی بزم ہائے طلوع اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسب ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے :-

نوٹ : پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور ٹیپیں بزموں کے لئے ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں -

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف :-
لاہور	جمعہ ۸½ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے دوپہر	76, PARK ROAD, ILFORD. TEL: 553-1896
برمنگھم (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار دو بجے دوپہر	(بمقام) 60. HERICK RD. SALTLEY, B8 1NT.
اوسلو (ناروے)	ہر ماہ کا پہلا سنیچر شام ۴ بجے	(بمقام) MR MANZOOR AHMAD, DOVRE GATE-7/OSLO-1
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFTWOOD AVE #311, DOWNS VIEW, TORONTO (NORTH YORK) (ONT): M3N-2P3. PHONE (416) 661-2827
کراچی ۳	ہر جمعہ ۹½ بجے صبح	کتب خانہ بزم طلوع اسلام کمرہ ۲۴ ہارون چیمبرز رابطات حسین روڈ نیو چالی۔ فون ۲۳۸۸۲۸
پشاور	۱- ہر جمعہ ۵ بجے شام ۲- ہر جمعہ ۹ بجے صبح	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر (OPP: VIP. MAINGATE) پشاور سٹیشن بازہ روڈ فون ۷۴۵۹ ہوٹل نعمت کدہ۔ یونیورسٹی روڈ۔ جہانگیر آباد۔
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف۔ محمود علی صاحب - اتمانخیل بلڈنگ نواب علی روڈ
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی - ۱۶۶ لیاقت روڈ
لیہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر مکینیکل انجینئرنگ ورکس۔ شہید روڈ لیہ
ایبٹ آباد	ہر جمعہ ۴ بجے شام	رہائش گاہ صلاح الدین صاحب۔ واقع 23A-K-L کہیال (ایبٹ آباد)
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہپہر	چوک واٹر سپلائی ٹی مکان نمبر ۴۔ نظامی منزل
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ۔ غنی پور باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب۔
چکوال	ہر جمعہ ۹½ بجے صبح	ضیا ٹیوشن سنٹر، نزد ہجویری مسجد باہتمام ماسٹر غلام حسین صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام۔
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر توغی روڈ۔ باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم ملحق رہائش گاہ : چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ سول لائنز۔
گجرات	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ و ہر اتوار ۴ بجے سہپہر	بمقام ۲۰/۱۲ بی۔ بھمبر روڈ... باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)
ملتان	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	دفتر شاہ ٹیز بیرون پاک گیٹ (فون : ۳۱۰۷۱)
مجلس ٹھٹھیا کبیروالا ملتان	ہر جمعہ ۳ بجے سہپہر	بمقام۔ مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)
ہنگو	ہر جمعہ ۵½ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون ۶۸)
فیصل آباد	ہر جمعہ ۴½ بجے بعد دوپہر	بمقام حیات سرجری کلینک ۲۳/پ پیپلز کالونی ۱ (فون ۵۵۸۲۲۴)

باسمہٖ تعالیٰ

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ

قرآن اور سائنس

(وہ نکتہ جس میں ملّتِ اسلامیہ کی زندگی اور ارتقا کا راز پوشیدہ ہے اور جس کے خلاف عالمگیر سازش ہو رہی ہے)

پرویز

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بتقریب جشنِ نزولِ قرآن

قرآن اور سائنس

(پرویز صاحب کا خطاب)

عزیزانِ گرامی قدر، سلام و رحمت!

یوں تو ہمارا ہر درس، قرآنِ مجید ہی کا درس ہوتا ہے، لیکن آج کے درس کا تعلق جس عظیم القدر تقریب کے ساتھ ہے، اس سے اس کی اہمیت اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ دنیا کی ہر قوم اور اہلِ مذاہب سال میں کچھ دن بطور تیوہار مناتے ہیں۔ لیکن وہ تیوہار بہرحال انسانوں کے اپنے متعین کردہ ہوتے ہیں۔ یہ خصوصیت ..... اسلام کو حاصل ہے کہ اس کے تیوہار کا نہ صرف تعین خود خدا نے کیا ہے بلکہ اس کے منانے کا خاص طور پر حکم بھی دیا ہے۔ اس سے اس تیوہار کی اہمیت اور عظمت واضح ہے۔ آج کا درس اسی تیوہار کے ساتھ مختص ہے ـــــ سورۂ یونس میں ہے: یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ..... (۱۰/۵۷) "اے نوعِ انسان! تمہاری طرف، تمہارے نشوونما دینے والے کی جانب سے ایک ضابطۂ قوانین نازل ہوا ہے جو تمہارے نفسیاتی امراض کے لئے نسخۂ شفا ہے"..... وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ "اور ان لوگوں کے لئے جو اس کی صداقتوں پر یقین رکھیں، سامانِ نشوونما اور منزلِ انسانیت تک پہنچنے کی راہ نمائی ہے"۔ اس قدر گراں بہا عطیہ کے بعد فرمایا: قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ ..... "اے رسول! ان سے کہدو کہ یہ محض خدا کے فضل و رحمت سے ہے کہ تمہیں ایسا عدیم النظیر ضابطۂ حیات مل گیا ہے۔ ایسا بے نظیر ضابطۂ حیات کہ اگر ساری دنیا کے انسان مل کر بھی کوشش کرتے تو اس کے ایک جزو جیسا ضابطہ بھی مرتب نہ کر سکتے۔ لہٰذا، فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ..... "تمہیں چاہیئے کہ ایسی متاعِ گراں بہا کے اس طرح بے مزد و معاوضہ مل جانے پر جشنِ مسرت مناؤ" ـــــ وہ متاعِ گراں بہا کہ ..... هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝ (۱۰/۵۸) "انسان جو کچھ اور جتنا کچھ بھی جمع کرے یہ اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے" ـــــ ساری متاعِ کائنات سے زیادہ گراں بہا۔ تمام سامانِ زیست سے زیادہ بیش قیمت۔

یہ ہے وہ تقریبِ جاں نواز جسے بطورِ جشنِ مسرت منانے کا حکم خدا نے دیا ہے۔ یعنی جشنِ نزولِ قرآن۔ نزولِ قرآنِ کریم کا آغاز چونکہ رمضان کے مہینے میں ہوا تھا (۲/۱۸۵) اس لئے رمضان کا پورا مہینہ گویا اس جشن کی تیاریوں کا تھا اور عید الفطر اس کی تکمیل کا دن۔ ہم لوگ چونکہ قرآن کی ہر حقیقت کو فراموش کر چکے ہیں اس لئے ہم میں سے شاید ہی کسی کو علم ہو کہ یہ عید کیا ہے اور ہم اسے کیوں مناتے ہیں۔ اب یہ محض ایک رسم ہے جسے روایتاً ادا کر لیا جاتا ہے ——— مذہب پرست طبقہ کے نزدیک ثواب حاصل کرنے کے لئے، اور عوام کے نزدیک سیویاں کھانے کے لئے ..... اور اب تو وہ بھی ان بیچاروں کی دسترس سے باہر ہو چکی ہیں ——— ان کے لئے سیویاں اور ان کے معصوم بچوں کے لئے کھلونے!

اقبالؒ نے تو ساٹھ ستر برس پہلے یہ آہ کھینچی تھی کہ ؎

اے بادِ صبا! کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا!
قبضے سے اُمّت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

اور عید کا چاند دیکھ کر کہا تھا کہ ——— ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے ——— وہ آج زندہ ہوتا تو ہماری حالت دیکھ کر معلوم کس طرح خود بھی تڑپتا اور ہمیں بھی تڑپاتا ——— یہ اس قوم کی حالت ہے جسے قرآن

اِس میں تمہارا ذکر ہے

جیسا ضابطۂ زندگی عطا کرنے کے بعد کہا تھا کہ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (۲۱/۱۰) "یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں خود تمہارا ذکر ہے۔ کیا تم اس بلند حقیقت پر غور نہیں کرتے؟" عربی زبان میں لفظ ذکر کے ایک معنی تو وہی ہیں جو ہمارے ہاں مروّج ہیں۔ اس اعتبار سے اس آیۂ جلیلہ کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن خود انسان کا ترجمان ہے۔ علامہ اقبالؒ نے خدا کو مخاطب کرتے ہوئے اس حقیقت کو اس حسین انداز سے بیان کیا تھا کہ ؎

محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا!
مگر یہ حرفِ شیریں، ترجماں تیرا ہے یا میرا!

لیکن اس لفظ (ذکر) کے ایک اور معانی بھی ہیں۔ یعنی شرف و عظمت۔ عزّت و توقیر۔ ان معانی کی رو سے اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس کتاب میں خود تمہارے شرف و اجتباء کا راز پوشیدہ ہے۔ یہ اس لئے بھیجی گئی ہے کہ تمہیں عزّت و توقیر کا مقامِ بلند عطا کر دے۔ اسی لئے دوسرے مقام پر کہا کہ ——— بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ (۲۳/۷۱) ہم انہیں شرف و مجد کا مقام عطا کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان کی حماقت دیکھو کہ یہ خود اپنی ہی عزّت و احترام سے اعراض برتتے ہیں۔ اس سے روگردانی کرتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ (۳۳/۷۲) "حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی ظالم اور جاہل واقع ہوا ہے۔" یہ جہالت کی بنا پر خود اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔ ہم، قرآن کی حامل قوم، اسی مقام پر ہیں۔ ساری دنیا میں ذلیل و خوار۔

قرآنِ کریم نے اپنی منفرد خصوصیات کی بنا پر تمام نوعِ انسان کو یہ چیلنج دیا ہے کہ وہ اس کی مثل ضابطۂ حیات مرتب کر کے دکھائیں۔ یہ خصوصیات بکثرت ہیں اور کسی ایک نشست میں ان کا احاطہ ممکن نہیں۔ میں آج کی تقریب میں اس کی صرف ایک خصوصیت پر اکتفا کروں گا جسے عصرِ حاضر میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ دنیا کے کسی مذہب کو لیجئے اس نے انسانی زندگی، بلکہ جملہ تخلیقِ خداوندی کو دو حصوں

مادی اور روحانی دُنیا

میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یعنی مادی (MATERIAL) اور روحانی (SPIRITUAL)۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں بلکہ متضاد اور معاند ہیں۔ ایسے معاند کہ، نہ صرف یہ کہ یہ یک جا اکٹھے نہیں ہو سکتے، اہلِ مذہب، مادیت کو انتہائی قابلِ نفرت قرار دیتے ہیں اور مذہب کا سخت دشمن۔ دوسری طرف اہلِ مادیت (جنہیں آجکل کی اصطلاح میں سائنٹسٹ کہہ لیجئے) مذہب کو جہالت اور توہم پرستی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان دونوں میں جنگ، قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ عصرِ حاضر کی سیکولرازم، مذہب کے خلاف اسی نفرت کا نتیجہ ہے۔ وہ مذہب کا نام تک لینا پسند نہیں کرتے۔

لیکن قرآنِ کریم کی منفرد خصوصیت کو دیکھئے کہ وہ (یوں کہئے کہ) مذہب کے اسٹیج پر کھڑا ہو کر، مادی کائنات کے نظام کو اپنی صداقت کی تائید میں بطورِ شہادت پیش کرتا ہے۔ قرآنی تعلیم کا بنیادی نکتہ قانون کی عمل داری (RULE OF LAW) ہے۔ اس کا منتہیٰ اور مقصود تو انسانی دنیا میں قانونِ خداوندی کی حاکمیت ہے لیکن چونکہ قانون کی حاکمیت، خارجی کائنات کے محسوس پیکروں میں نہایت آسانی سے سامنے آجاتی ہے، اس لئے وہ انہیں قرآنی دعاوی کی تائید میں بطورِ شواہد پیش کرتا ہے۔ (مثلاً) سورۂ واقعہ میں ہے: فَلَآ أُقْسِمُ بِمَوَٰقِعِ ٱلنُّجُومِ ..... (۵۶/۷۵) "نہیں! بات یہ نہیں کہ میں اپنے دعاوی کے ثبوت میں نظری دلائل یا بسیط حقائق (ABSTRACT REALITIES) پیش کر کے آگے بڑھ جاؤں گا۔ میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ نظری یا تجریدی دلائل عام فہم نہیں ہوتے۔ میں کائنات کے مرئی اور محسوس نظام کی مثالوں سے

کائناتی شواہد

واضح کروں گا کہ یہ تمام نظام کس طرح قوانین کے تابع مصروفِ گردش ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ستاروں کی گذرگاہوں کو بطورِ شہادت پیش کرتا ہوں" وَإِنَّهُۥ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ (۵۶/۷۶) "اور اگر تم علم و بصیرت کی بارگاہ سے دریافت کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ شہادت کس قدر محکم اور پائیدار ہے"۔

ہم شہروں کے رہنے والے ستاروں کی گذرگاہوں کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس کے متعلق پوچھئے صحرا نوردوں سے جن کی ساری زندگی سفر میں گذرتی تھی اور سفر بھی بیشتر رات کی تاریکی میں، اُس صحرا میں جہاں نہ کوئی نشانِ راہ ہوتا تھا، نہ دلیلِ منزل۔ ان حالات میں ان کے سفر کی راہ نمائی صرف ستاروں کی گذرگاہوں سے ہوتی تھی۔ وہ ان سے راستہ کا تعین کرتے تھے اور انہیں اس کا عملی یقین ہوتا تھا کہ وہ نہ راستہ بتانے میں کبھی غلطی کریں گے، نہ منزل کی طرف لے جانے میں فریب دیں گے۔ آج بھی ان گذرگاہوں

کی اہمیت جہاز رانوں اور علم الافلاک کے محققین سے دریافت کی جا سکتی ہے۔ ان گذرگاہوں کو بطور شہادت پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ (۵۶/۷۷)

جس طرح یہ ستارے تمہیں منزلِ مقصود تک پہنچانے میں چراغِ راہ بنتے ہیں، اور اس میں کبھی دھوکا نہیں دیتے۔ اسی طرح یہ قرآن بھی انسانی زندگی کے سفر میں تمہاری راہ نمائی کرے گا۔ اور اس میں نہ غلطی کرے گا۔ نہ دھوکا دے گا۔

سورۃ تکویر میں اس اجمال کو قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جہاں کہا کہ فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ۝ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ۝ (۸۱/۱۵-۱۶) "یہی نہیں۔ بلکہ میں شہادت میں پیش کرتا ہوں ان سیاروں کو جو پچھلے پاؤں لوٹ جاتے ہیں اور انہیں بھی جو برق رفتار غزال کی طرح تیزی سے آگے بڑھ کر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں"۔ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ۝ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ۝ (۸۱/۱۷-۱۸) "اور شہادت میں پیش کرتا ہوں لیلائے شب کو جب وہ دبے پاؤں آتی ہے اور اسی طرح خاموشی سے لوٹ جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی عذرائے سحر کو جب وہ اپنی سبک النفسی سے ساری دنیا کو حیاتِ نو کا پیغام دینے مشرق کے جھروکے سے نمودار ہوتی ہے۔ میں شہادت پیش کرتا ہوں ان تمام کائناتی شواہد کو اس حقیقت کی تصدیق کے لئے کہ

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ۝ (۸۱/۱۹)

"جس شخص کی زبان سے تم اس "قرآن" کو سُن رہے ہو، وہ یہ کچھ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا۔ وہ تو ہمارا قاصد ہے، اور ہمارا پیغام تم تک پہنچا رہا ہے۔ وہ قاصد نہایت واجب التکریم ہے، اور یہ پیغام بھی واجب التکریم (۵۶/۷۷)۔ اور جس خدا نے اسے بھیجا ہے وہ بھی واجب التکریم (۲۳/۱۱۶)"۔

سورۃ الطارق میں ہے: وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ۝ ... (۸۶/۱۱) "یہ فضائی کُرّے جو اس قدر عظیم الجثہ ہونے کے باوجود اس حسن و خوبی سے اپنے اپنے مدار میں مصروفِ گردش ہیں (۳۶/۴۰) اور اپنی گردش سے زندگی کے نئے نئے پہلو سامنے لاتے ہیں وہ بھی اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ اور یہ زمین بھی جو بیج کو پھاڑ کر اس میں سے ایک کونپل کی شکل میں ایک نئی زندگی کی نمود کرتی ہے (وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ۔ ۸۶/۱۲) یہ سب اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ ——— اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ۝ .. (۸۶/۱۳) "یہ قرآن ایک فیصلہ کن حقیقت ہے۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ غلط اور صحیح، حق اور باطل کو، نکھار کر الگ کر دیتا ہے"۔ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ۝ .... (۸۶/۱۴) "یہ یونہی مذاق نہیں۔ تم کہتے ہو کہ یہ شاعری ہے جسے زمانے کی گردشیں خود بخود مٹا دیں گی"۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (۵۲/۳۰) "یہ بھی تمہارا واہمہ ہے"۔ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ۝ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ۝ (۶۹/۳۸-۳۹) "جو کچھ تمہیں دکھائی دیتا ہے۔ یعنی یہ عالمِ محسوس۔ اور جو کچھ تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ ہے وہ سب اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ .... (۶۹/۴۰-۴۱) "یہ قرآن ایک واجب التکریم قاصد کی وساطت سے پہنچنے والا ابدی حقائق کا مجموعہ ہے۔ یہ شاعرانہ تخیلات کا نگاہ فریب مرقع نہیں جو مرورِ زمانہ سے حرفِ غلط کی طرح مٹ

جایا کرتے ہیں"۔

قرآنِ کریم میں بکثرت مقامات ہیں جہاں نظامِ کائنات اور اس کے عناصر کو قرآنی حقائق اور دعاوی کی تائید میں بطورِ شہادت پیش کیا گیا ہے۔ نظامِ کائنات کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے تمام رموز و اسرار بیک وقت سامنے نہیں آجاتے۔ جوں جوں علمِ انسانی ترقی کرے گا اور محققین کی کاوشیں ان پر چھپے ہوئے پردوں کو اٹھاتی جائیں گی۔ یعنی انہیں (DISCOVER) بے نقاب کرتی جائیں گی یہ اُبھر کر سامنے آتے جائیں گے۔ اسی بنا پر قرآن نے کہا ہے کہ

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝ (۴۱/۵۳)

ہم عالمِ النفس و آفاق۔ یعنی انسان کی خود اپنی زندگی اور خارجی کائنات میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے۔ اور ہر حقیقت جو اس طرح بے نقاب ہو گی اس امر کی شہادت پیش کرے گی کہ قرآن کا ہر دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ قرآن اس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے کہ تمام مستور حقائق اس کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔ وہ تمہاری نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں، اس سے نہیں۔

اس آیۂ جلیلہ میں قرآنِ کریم نے عظیم حقائق کو پیش کیا ہے۔ اس نے اربابِ علم و دانش کو تاکید کی ہے کہ وہ رموزِ فطرت دریافت کرنے میں مسلسل کوشش کرتے رہیں۔ اور دوسرے اس نے یہ کہا ہے کہ قرآنِ کریم کے احکام و اوامر تو ہر دور میں واضح طور پر سامنے رہیں گے، لیکن اس کے حقائق و معارف تمام کے تمام کسی ایک دور میں منکشف نہیں ہو جائیں گے۔ علمِ انسانی کی سطح جوں جوں بلند ہو گی یہ رفتہ رفتہ بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ اس لئے یہ ہر زمانے کے اربابِ علم کے لئے موضوعِ تحقیق و ہدفِ کاوش رہے گا۔ اس کا حرفِ آخر، آخری دور کے انسان کے لئے چھوڑا گیا ہے۔ لہٰذا، کسی دور کے انسانوں کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ قرآنی حقائق کے متعلق جو کچھ سمجھا جانا تھا سمجھا جا چکا ہے۔ اب اس میں فکر و تدبر کے لئے کچھ باقی نہیں رہا۔

مومنین کا شیوہ

نظامِ کائنات کی یہی اہمیت ہے جس کے پیشِ نظر اس نے علمی تحقیقات پر اس قدر زور دیا ہے۔ (مثلاً) سورۂ آلِ عمران میں ہے:۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ (۳/۱۸۹-۱۹۰)

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں ان کے لئے تخلیقِ کائنات اور گردشِ لیل و نہار میں قوانینِ خداوندی کی حقیقت اور ہمہ گیری کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں ان صاحبانِ عقل و بصیرت اور اربابِ فکر و نظر کے لئے جو زندگی کے ہر گوشے میں، کھڑے بیٹھے لیٹے، قوانینِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کی تخلیقی ترکیب پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ اور اپنی تحقیقات اور انکشافات کے بعد علی

وجہ البصیرت پکار اُٹھتے ہیں کہ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے اس کارگہِ کائنات کو نہ تو عبث و بے کار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لئے۔ تیری ذات اس سے بہت بلند ہے کہ تو اتنے عظیم نظام کو بلا مقصد پیدا کر دے۔ یہ ہماری کم علمی اور کوتاہ نگہی ہے کہ ہم تحقیق سے کام نہیں لیتے اور اس طرح اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہ کر عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم علمی تحقیقات اور عملی تجربات کے بعد عناصرِ کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اس طرح تباہ کن عذاب کی زندگی سے محفوظ رہیں۔

علماء کون ہیں؟

ہمارے ہاں جن حضرات کو "علماءِ کرام" کہا جاتا ہے، قوانینِ فطرت کے متعلق ان کے مبلغِ علم کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن دیکھئے کہ قرآن مجید، علماء کن لوگوں کو قرار دیتا ہے۔ سورۂ فاطر میں ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ..... (۳۵/۲۷) "تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ بادلوں سے ایک جیسا پانی برستا ہے لیکن اس سے مختلف انواع و اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ سب پھل اور فصلیں ایک جیسی ہوں"..... وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ (۳۵/۲۷) "اور پہاڑوں کو دیکھو کہ ان کا مادۂ تخلیق ایک ہی تھا لیکن ان میں مختلف رنگوں کے خطے ہیں ـــــ کوئی سفید۔ کوئی سرخ۔ کوئی کالا بھجنگ" (اور ہر خطہ اپنے اندر ارتقائی منازل کی داستانیں مرقوم و محفوظ رکھے ہوئے ہے)۔ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ..... (۳۵/۲۸) "اسی طرح انسان اور دیگر حیوان اور مویشی بھی مختلف النوع ہیں"۔

آپ غور کیجئے کہ علومِ سائنس کے مختلف شعبے ان آیات کے اندر آ گئے ہیں۔ اس کے بعد کہا کہ صحیفۂ فطرت کے یہ اوراق جو قوانینِ خداوندی کی زندہ شہادت ہیں، سب کے سامنے کھلے رہتے ہیں، لیکن ان ..... قوانین کی عظمت کے سامنے وہی جھکتے ہیں جو ان پر علم و بصیرت کی رُو سے غور کرتے ہیں۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ۝ (۳۵/۲۸) "یہی لوگ ہیں جو علماء کہلانے کے مستحق ہیں اور یہی جان سکتے ہیں کہ خدا کا قانون کس قدر غلبہ کا مالک ہے اور جو لوگ ان کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں، وہ انہیں کس قدر سامانِ حفاظت عطا کر دیتا ہے"۔ (نیز ۳۰/۲۲-۲۴)۔ آپ غور کیجئے کہ جن لوگوں کو قرآن کریم نے علماء کہا ہے، کیا وہ وہی نہیں جنہیں دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں سائنٹسٹ کہا جاتا ہے؟

تسخیرِ کائنات

قرآن کریم نے، نظامِ کائنات پر غور و فکر کی محض نظری طور پر تاکید ہی نہیں کی۔ اس نے کہا ہے کہ

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۚ اِنَّ فِيْ

ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (۴۵/۱۳)

اللہ تعالیٰ نے اپنے قوانین کی رُو سے، کائنات کی پستیوں اور بلندیوں (یعنی جملہ کائنات) کو تمہارے لئے تابع تسخیر کیا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو وہی لوگ سمجھ سکیں گے جو غور و فکر سے کام لیں گے۔

اس نے کہا یہ ہے کہ قوانینِ فطرت کا علم حاصل کرنا اس لئے ضروری ہے کہ تم اس سے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر سکو گے۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن نے جو شروع ہی میں کہا تھا کہ اس میں خود تمہارے لئے شرف و مجد کا راز پوشیدہ ہے، تو وہ دعویٰ کس قدر صداقت پر مبنی ہے۔ جو قومیں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیتی ہیں، انہیں کس قدر قوت اور ثروت حاصل ہو جاتی ہے، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اُمتِ مسلمہ کے لئے یہ چیز، شرف و مجد کا صرف ایک پہلو ہیں۔ اس کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں قرآن کی ابدی اقدار کے مطابق صرف میں لایا جائے۔ (اس کے متعلق تفصیل سے بعد میں گفتگو کی جائے گی)۔

علامہ اقبالؒ نے قصۂ آدم کو اپنے تمثیلی انداز میں بڑے خوبصورت اسلوب سے پیش کیا ہے۔ آدم فرشتوں کے جلو میں زمین کی طرف آتا ہے تو روحِ ارضی یہ کہہ کر اس کا استقبال کرتی ہے کہ

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ!

ہیں تیرے تصرّف میں یہ بادل یہ گھٹائیں | یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں!

یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں | تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!

خورشیدِ جہاں تاب کی ضَو تیرے شرر میں | آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں!

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں | جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ!

(بالِ جبریل صفحہ ۱۲۸)

---(○)---

خارجی کائنات سے آگے بڑھ کر، اب خود انسان کی طرف آئیے۔ قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر بتایا ہے کہ انسان، حیوانات سے اشرف اور ممتاز اس لئے ہے کہ اسے غور و تدبّر۔ عقل و فکر۔ علم و بصیرت کی صلاحیت دی گئی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ انسان کے حیطۂ علم و بصیرت سے صرف ایک چیز باہر ہے۔ اور وہ ہے وحی کی کُنہ و حقیقت۔ یعنی یہ کہ حضرات انبیاء کرامؑ کو وحی کس طرح ملتی تھی اور اس کا سرچشمہ کیا تھا۔ صرف یہ چیز عقلِ انسانی سے ماوراء ہے۔ عقلِ انسانی نہ وحی کی تخلیق کر سکتی ہے، اور نہ یہ جان سکتی ہے کہ نبی کو وحی ملتی کس طرح تھی۔ اس کے بعد، جب

حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے، وحی انسانوں تک پہنچ جاتی تھی، تو اسے غور و فکر اور علم و بصیرت کی رُو سے سمجھا جا سکتا تھا۔ قرآن کریم نے علم و عقل اور فکر و بصیرت کی اہمیت پر اس قدر زور دیا ہے کہ اس کی تفصیل میں جانے کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہوگی۔ وہ عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو جہنمی قرار دیتا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے: وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ط ..... (۷/۱۷۹) صحرائی اور شہری آبادیوں کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کا اندازِ زیست زبانِ حال سے بتاتا ہے کہ یہ جہنمی مخلوق ہے ..... لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ط أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ط ..... (۷/۱۷۹) "یہ وہ لوگ ہیں جو سینوں میں دل تو رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ وہ ماتھے پر آنکھیں بھی رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ لوگ دیکھنے میں تو انسان نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت حیوان ہوتے ہیں۔ بلکہ ان سے بھی گئے گذرے ....."

عقل و فکر سے کام نہ لینے والے

سورۂ انفال میں ہے: إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۝ (۸/۲۲) "خدا کے نزدیک بدترین خلائق وہ لوگ ہیں جو بہرے اور گونگے بنے رہتے ہیں یعنی وہ لوگ جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ سورۂ الملک میں ہے کہ جہنم کا داروغہ جہنم میں داخل ہونے والوں سے پوچھے گا کہ تم نے کیا کیا تھا جس کی وجہ سے تم جہنم میں داخل کئے جا رہے ہو؟ وہ جواب میں کہیں گے کہ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ۝ (۶۷/۱۰) "اگر ہم سچی بات دل کے کانوں سے سنتے اور عقل و فکر سے کام لیتے تو اہلِ جہنم میں سے نہ ہوتے"۔ عقل و فکر سے کام نہ لینا ہے جس کی وجہ سے ہم جہنم میں دھکیلے جا رہے ہیں۔ سورۂ حٰمٓ میں ہے کہ قرآن تو ہے ہی ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہوں۔ كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝ (۴۱/۳) "قرآن واضح عربی زبان کی کتاب ہے جس کے احکام و حقائق نکھار کر بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ اس قوم کے لئے ہے جو علم و عقل سے کام لے"۔ یہ تو آپ پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن علم کسے قرار دیتا ہے اور علماء کن لوگوں کو کہتا ہے۔

قرآن کریم تدبّر و تفکّر پر بڑا زور دیتا ہے۔ وہ قرآن سے اعراض برتنے والوں کے متعلق کہتا ہے: أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ۝ (۴۷/۲۴) "یہ لوگ قرآن میں تدبّر نہیں کرتے۔ کیا انہوں نے اپنے دلوں پر (خود ساختہ) تالے ڈال رکھے ہیں؟" (نیز ۲۳/۶۸) سورۂ النساء میں ہے: أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ط وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۝ (۴/۸۲) "کیا یہ لوگ قرآن میں تدبّر نہیں کرتے۔ اگر یہ فکر و تدبّر سے کام لیتے تو یہ حقیقت

واضح ہو جاتی کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اور یہ بھی اس کے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل ہے۔" سورۂ ص میں ہے: كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ (۲۹/۳۸) "یہ مبارک کتاب ہم نے تیری طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس میں غور و تدبر کریں۔ اور صاحبانِ عقل و بصیرت اس سے حقائق پر آگاہ ہوں۔"

ظاہر ہے کہ یہ غور و تدبر کسی خاص دور تک محدود نہیں تھا کہ قرآن پر جس قدر تدبر کیا جانا تھا وہ اس دور میں کیا جا چکا ہے۔ اور اب اس پر مزید غور نہیں کیا جا سکتا۔ تدبر کا لفظ تمام مسلمانوں کے لئے اور ہر زمانے کے لئے ہے۔ جب قرآن قیامت تک کے لئے ضابطۂ راہ نمائی ہے تو اس پر غور و فکر کے دروازے بھی ہمیشہ کے لئے کھلے ہیں۔ یہ کہنا کہ غور و تدبر اسلاف تک محدود تھا۔ انہوں نے جتنا تدبر کیا جانا ضروری تھا، کر لیا۔ اب ہمیں ان کی تقلید کئے جانا چاہئے۔ قرآن کریم اس تصور اور مسلک کی بڑی شدت سے مخالفت کرتا ہے۔ کیونکہ اس سے عقل و فکر اور علم و بصیرت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اور انسان انسانی سطح سے گر کر، حیوانی سطح پر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں ہانکنے والا جدھر چاہے اُسے ہانک کر لے جائے۔ نہ کسی دور میں علم کی راہیں مسدود ہوتی ہیں، نہ قرآن میں غور و تدبر کے دروازے بند ہوتے ہیں۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ایمان کے معنی یہ ہیں کہ انسان بلا سوچے سمجھے ان باتوں کو مان لے جو ہمارے ہاں روایتاً چلی آ رہی ہیں۔ لیکن سنیئے کہ قرآن، مومن کن لوگوں کو قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے: وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝ (۲۵/۷۳) "مومن وہ ہیں کہ (اور تو اور) جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان پر بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے۔ غور و فکر کے بعد انہیں قبول کرتے ہیں۔" اسے کہتے ہیں قرآن کی رُو سے ایمان! یہ وجہ ہے جو وہ ہم پیدائشی مسلمانوں کو بھی ایمان لانے کے لئے کہتا ہے۔ (۴/۱۳۶)

یہ ہے عزیزانِ من! قرآن کی رُو سے، عقل و فکر اور علم و بصیرت کی اہمیت۔ صدرِ اوّل کے مسلمان اسی طرح ایمان لائے تھے اور تمام معاملات پر اسی انداز سے غور و فکر کرتے تھے۔

اس کے بعد کیا ہوا؟

لیکن اس کے بعد جب حالات نے پلٹا کھایا تو مخالفینِ اسلام نے سب سے پہلے تنزیلِ قرآنی کو انسانی تخیلات کے دبیز پردوں سے ڈھانپ دیا۔ جب وہ روشنی بجھ گئی تو اس کے ساتھ ہی عقل و فکر کی شمعیں بھی گل ہونا شروع ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کا مقصد یہ بتایا تھا:-

لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۔۔۔۔ (۵۷/۹)

یہ تمہیں جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر (علم و بصیرت کی) روشنی میں لے آئیگا۔

اس کے برعکس طاغوتی قوتوں کا حربہ یہ بتایا تھا: يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۔۔۔۔ (۲/۲۵۷) "وہ انہیں روشنی سے تاریکی کی طرف لے جائیں گی۔" ان قوتوں نے یہی حربہ استعمال

کیا۔ اور اس کے لئے انہیں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ انہوں نے کچھ روایات وضع کیں اور انہیں احادیثِ رسول اللہؐ کے نام سے مشہور کر دیا اور ان کے متعلق عقیدہ یہ وضع کر دیا کہ ان کے انکار سے مسلمان دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہ روایات کس قسم کی ہیں، انہیں آپ احادیث کے کسی بھی مجموعہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ میں یہاں دو چار ایسی روایات پیش

چند وضعی روایات

کروں گا۔ جامع ترمذی میں حضرت عباسؓ کی ایک روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک ۱۷ یا ۷۲، ۷۳ سال کی راہ ہے اور سات آسمان ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اسی قدر ہے۔ ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے۔ اس کے اوپر سات پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھروں سے گھٹنوں تک اسی قدر فاصلہ ہے۔ ان بکروں کی پشت پر عرش ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے۔

بخاری شریف کی ایک روایت ہے کہ نبی اکرمؐ سے پوچھا گیا کہ موسم کس طرح بدلتے ہیں کبھی سردی آجاتی ہے، کبھی گرمی۔ تو آپ نے فرمایا کہ

دوزخ نے اپنے پروردگار سے شکایت کی کہ اے میرے پروردگار! میرے ایک حصّے نے میرے دوسرے حصّے کو کھا لیا ہے۔ تو اللہ تعالےٰ نے اسے دو مرتبہ سانس لینے کی اجازت دے دی۔ ایک سانس جاڑوں میں، اور ایک گرمی میں۔ پس تم جو سخت سردی دیکھتے ہو تو یہ بھی جہنم کی سانس ہے۔

اسی بخاری میں ہے:۔

حضرت ابوہریرہؓ، نبی (صلعم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا۔ ایک گروہ بنی اسرائیل کا کھو گیا۔ نہیں معلوم کیا ہوا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ چوہے ہی ہیں کہ جب ان کے سامنے اونٹ کا دودھ رکھا جاتا ہے تو وہ نہیں پیتے اور جب ان کے سامنے بکریوں کا دودھ رکھا جاتا ہے تو وہ پی لیتے ہیں۔

اسی کی ایک اور روایت:۔

حضرت ابوہریرہؓ، نبی (صلعم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ بنی اسرائیل برہنہ غسل کیا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھتا۔ اور حضرت موسےٰؑ تنہا غسل کیا کرتے تھے۔ تو بنی اسرائیل نے کہا کہ واللہ! موسےٰؑ کو ہم لوگوں کے ساتھ غسل کرنے سے سوا اس کے کچھ مانع نہیں کہ وہ فتق میں مبتلا ہیں۔ اتفاق سے ایک دن موسیٰؑ غسل کرنے لگے اور اپنا لباس پتھر پر رکھ دیا۔ وہ پتھر ان کا لباس لے کر بھاگا۔ اور حضرت موسےٰؑ بھی اس کے پیچھے پیچھے یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ "ثوبی یا حجر! ثوبی یا حجر!!" اے پتھر!

میرے کپڑے دے دے۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل نے موسیٰؑ کی طرف دیکھ لیا اور کہا کہ واللہ! موسیٰؑ کو کچھ بیماری نہیں۔ اور پتھر ٹھہر گیا۔ موسیٰؑ نے اپنا لباس لے لیا اور پتھر کو مارنے لگے۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم! حضرت موسیٰؑ کی مار سے اس پتھر پر چھ یا سات نشان اب تک باقی ہیں۔[1]

اگر یہ وضعی روایات، احادیث کے مجموعوں میں ہی محفوظ رہتیں تو بھی ان توہم پرستیوں کا دائرہ محدود رہتا۔ لیکن اس کے بعد یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ قرآن مجید کی بھی وہی تفسیر قابلِ اعتماد ہے جو نبیؐ اکرم نے ارشاد فرمائی ہے۔ اور یہ وہ تفسیر ہے جو ان روایات کی بنیادوں پر مرتب ہوتی ہے۔

قرآن کی تفسیر

یہ تفسیر کس قسم کی ہوتی ہے، میں اس کا صرف ایک نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ تفسیر ابن کثیر ہمارے ہاں کی نہایت قابلِ اعتماد تفسیر قرار دی جاتی ہے۔ اس میں حضرت نوحؑ کی کشتی کی تفاصیل بھی دی گئی ہیں جو قرآن میں نہیں ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ

وہ بارہ سو ہاتھ لمبی اور چھ سو ہاتھ چوڑی تھی۔ تین درجوں کی تھی۔ ایک میں جانور اور چوپائے تھے۔ دوسرے میں انسان۔ تیسرے میں پرند۔ جب جانوروں کا گوبر پھیل گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کی طرف وحی بھیجی کہ ہاتھی کی دم ہلاؤ۔ اس کے ہلاتے ہی اس سے خنزیر نر اور مادہ نکل آئے اور وہ میلا کھانے لگے۔ چوہوں نے جب اس کے تختے کترنے شروع کئے تو حکم ہوا کہ شیر کی پیشانی پر انگلی لگاؤ۔ اس سے بلی جوڑا نکلا اور چوہوں کی طرف لپکا۔

کشتی میں جو مخلوق سوار ہوئی تھی اس کے متعلق بھی تفصیل دی گئی ہے۔ لکھا ہے کہ نوحؑ کو حکمِ خدا ہوا کہ اپنے ساتھ جاندار مخلوق کی ہر قسم کا ایک ایک جوڑا نر، مادہ، سوار کرا لو۔

سب سے آخر، گدھا سوار ہونے لگا تو ابلیس اس کی دم کے ساتھ لٹک گیا۔ جب اس کے دو اگلے پاؤں کشتی میں آ گئے اور اس نے اپنا پچھلا دھڑ اٹھانا چاہا تو نہ اٹھ سکا۔ کیونکہ دم پر اس ملعون کا بوجھ تھا۔ حضرت نوحؑ جلدی کر رہے تھے۔ گدھا بہتیرا چاہتا تھا لیکن پچھلے پاؤں چڑھ نہیں سکتا تھا۔ آخر آپ نے فرمایا۔ آجا گو تیرے ساتھ ابلیس بھی ہو۔ تب وہ چڑھ گیا اور ابلیس بھی اس کے ساتھ آ گیا۔

(تفسیر ابن کثیر۔ اردو ترجمہ مولانا محمد جوناگڑھی۔ بارھواں پارہ۔ صفحہ ۱۰)

یہ ہیں وہ احادیث اور یہ ہیں وہ تفاسیر جنہیں (آٹھ نو سال تک) پڑھنے کے بعد ہمارے دارالعلوموں کے طلباء، علماء بن جاتے ہیں۔ ان دارالعلوموں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد، ان طالب علموں کی ذہنی کیفیت

---

[1] ان روایات کے حوالوں کے لئے ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقامِ حدیث" دیکھئے

کس قسم کی ہو جاتی ہے، اس کے متعلق ہم سے نہیں، انہی کے زمرہ کے ممتاز ترین علماء کی زبانی سنیئے۔ مصر کی جامع ازہر کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ وہ دنیا میں قدیم مذہبی تعلیم کی سب سے بڑی درسگاہ ہے۔ اور علامہ جمال الدین افغانیؒ (مرحوم) کے شاگردِ رشید مفتی محمد عبدہٗ (مرحوم) کا نام بھی سُن رکھا ہوگا جن کا شمار، ایک مدت تک اس یونیورسٹی کے بلند ترین ارکان میں ہوتا تھا۔ وہ اس یونیورسٹی کے متعلق لکھتے ہیں کہ

> جو شخص ازہر یا اس قبیل کے مدارس میں جتنی مدت تک تحصیلِ علم کرتا ہے اتنی ہی اس میں تحصیلِ علم کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ (تفسیر المنار حصہ اوّل۔ صفحہ ۱۹۱)

ان کے شاگردِ رشید علامہ رشید رضا (مرحوم) اپنے استاد کا یہ قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

> ان کا خیال تھا کہ علماءِ ازہر اور ان کی قسم کے اور بڑے بڑے شیوخ و علماء وہ لوگ ہیں جن کی اصلاح کی امید باقی نہیں رہی۔

(○)

قلتِ وقت کی بنا پر میں اس وقت اربابِ شریعت تک محدود رہنا چاہتا ہوں، ورنہ اربابِ طریقت نے تو سرے سے دنیا اور اس کے متعلقات کو حرام اور کائناتی علوم کو باطل قرار دے رکھا تھا.... (تفصیل اس کی میری کتاب "تصوف کی حقیقت" میں ملے گی)۔ یہ تھی بہرحال، ظلمات ــــ گھٹا ٹوپ تاریکیوں ــــ کی وہ جہل آفریں فضا جس میں یہ اُمت صدیوں سے ڈوبے چلی آ رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ جس قوم کا علم و تحقیق کے متعلق یہ طرزِ عمل ہو، وہ مصائبِ زندگی میں دیگر اقوامِ عالم کا مقابلہ کس طرح کر سکتی ہے؟ نتیجہ یہ کہ آبادی، جغرافیائی محلِ وقوع، معدنی ذخائر، ارضی پیداوار کے امکانات وغیرہ کی اکثریت کے باوجود یہ اُمت، ذلت و خواری' اور محتاجی و محکومی کی زندگی بسر کرتی چلی آ رہی تھی۔ ویسے تو اس کی ساری دنیا میں یہی حالت تھی لیکن، ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد، یہ قریب المرگ ہو چکی تھی۔ لیکن مبدا فیض کی کرم گستری سے عین اس وقت یہاں ایک ایسا بطلِ جلیل پیدا ہو گیا جس نے واقعی مسیحائی کا کام کیا۔ وہ تھا سر سید احمد خان (اعلی اللہ المقامہٗ)

سرسید

سرسید نے سیاسی دنیا میں کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے، وہ سرِ دست میرے موضوع سے خارج ہیں۔ اس نے علمی دنیا میں جو معرکہ آرا انقلاب برپا کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس نے جب اس اُمت کے زوال پر غور کیا تو اس نے دیکھا کہ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جن علومِ فطرت (NATURAL SCIENCES) اور تسخیرِ فطرت پر اس قدر زور دیا تھا، اس قوم نے انہیں گم کر دیا اور ہر قسم کی جہالت اور توہم پرستی کو علم قرار دے دیا۔ چنانچہ اس نے اپنا اوّلین فریضہ یہ سمجھا کہ قوم کو بتایا جائے کہ قرآنِ مجید نے ان علوم کو کس قدر اہمیت دی ہے۔ اس زمانے میں فطرت کا لفظ ان معنوں میں نہیں استعمال ہوتا تھا جن معانی میں یہ اب استعمال ہونے لگا ہے۔ اس زمانے میں انگریزی کا لفظ نیچر ہی اس مفہوم کو ادا کر سکتا تھا۔ چنانچہ سرسید

نے، قرآن کریم کی روشنی میں، نیچر کے علوم اور اس کی تسخیر کی اہمیت کو بہ تکرار و اصرار واشگاف کیا۔ یہ واضح ہے کہ سائنٹیفک انکشافات، انسانی علم کی وسعت کے ساتھ بڑھتے اور (بعض مقامات پر) بدلتے جاتے ہیں۔ اس لئے (سرسید کے زمانے کے بعد) اس سو سال کے عرصہ میں ان میں اکثر تبدیلیاں آچکی ہیں۔ اس اعتبار سے، سرسید نے جو جزئیات اور فروعات پیش کی تھیں، ان میں سے اکثر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے ——— اور اس میں ہماری بھی کوئی کاریگری اور ہنرمندی نہیں۔ خود علمِ انسانی کی سطح بلند ہو گئی ہے لیکن اس نے جو اصول پیش کیا تھا اس سے قطعاً اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے بطورِ اصول یہ کہا تھا کہ جب تک مسلمان، قوانینِ فطرت کا علم حاصل کر کے، فطرت کی قوتوں کو مسخر نہیں کرتے، زندہ قوموں کی صف میں ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ یہ علوم (اس زمانے میں۔ اور اب بھی) انگریزی زبان میں تھے اس لئے اس نے انگریزی زبان کی تحصیل کو اوّلیں ضرورت قرار دیا۔ اس نے یہ کچھ نظری طور پر ہی نہیں کیا، اس کے لئے ایک درسگاہ قائم کر کے، اس کا عملی نمونہ بھی پیش کر دیا۔ اس شمع سے جو شعاعیں بلند ہوئیں اور پھیلیں۔ تو اس نے دور دور تک تاریکی کے پردوں کو چاک کر دیا۔ آج مسلمانوں کی دنیا میں علومِ فطرت کے جس قدر آثار دکھائی دے رہے ہیں وہ اسی مردِ راہ بیں کی دُور نگہی کا صدقہ ہیں۔ اس مسیحا نفس کا ملتِ مرحومہ پر جس قدر احسان ہے اس کا بدلہ ہی نہیں دیا جا سکتا۔ آج ملتِ اسلامیہ میں جس قدر ڈاکٹر۔ انجینئر۔ علوم طبیعیات اور علم الافلاک کے ماہرین اور دیگر دانشور ہیں وہ نخلِ سرسید ہی کے ثمار ہیں۔ اگر سرسید نہ آتا تو ہم آج بھی یہی کہتے کہ اوپر تلے سات آسمان ہیں۔ ساتویں آسمان پر سات پہاڑی بکرے ہیں جنہوں نے اپنی پشت پر عرشِ الٰہی اٹھا رکھا ہے۔

لیکن جو لوگ صدیوں سے آنکھیں بند کئے تاریکی میں زندگی بسر کر رہے تھے وہ اس روشنی کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے۔ اربابِ مذہب کی طرف سے سرسید کی مخالفت ہوئی اور سخت مخالفت۔ کفر کے فتوے چاروں طرف سے ہجوم کر کے اُمڈ آئے اور جب یہاں کے فتوؤں سے جی نہ بھرا تو مکّہ مدینہ سے فتوے منگائے گئے جن میں کہا گیا کہ

> یہ شخص دجّال اور مضلّ ہے۔ بلکہ ابلیسِ لعین کا خلیفہ ہے کہ مسلمانوں کے اغوا کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کا فتنہ یہود و نصاریٰ کے فتنہ سے بڑھ کر ہے۔ واجب ہے اولی الامر پر اس سے انتقام لینا۔ (حیاتِ جاوید)

نیچری

کسی کے خلاف کفر کا فتوےٰ عائد کرنے سے پہلے ضروری ہوتا ہے کہ اس پر کسی فرقے کی چٹ چسپکا دی جائے۔ سرسید تو فرقہ بندی کے خلاف تھا اس لئے اسے کسی فرقہ کی طرف نسبت سے مطعون کرتے، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں وہ نیچر پر بڑا زور دیتا تھا اس لئے کہا گیا کہ وہ نیچری ہے۔ اور نیچری کافر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد نیچری ایک فرقہ بنا دیا گیا۔ چنانچہ جو شخص سرسید کے خیالات سے متفق ہوتا اس کے متعلق کہہ دیا جاتا کہ وہ نیچری ہے۔ جس طرح آجکل جسے مطعون کرنا

مقصود ہو اس کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ پرویزی ہے۔ بہرحال سرسید کے خلاف کفر و الحاد کے فتوؤں کی بوچھاڑ ہوتی رہی اور وہ نہایت صبر اور ضبط سے انہیں برداشت کرتا رہا۔

کفر کے یہ فتوے اس شخص کے خلاف لگائے جا رہے تھے جو اپنے طالب علموں سے کہہ رہا تھا کہ

> یاد رکھو! سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ اس پر یقین رکھنے کی بدولت ہماری قوم، ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر تم اگر آسمان کے تارے بھی ہو گئے تو کیا؟ مجھے امید ہے تم علم اور اسلام دونوں کے نمونے ہو گے۔ اور جبھی ہماری قوم کو عزت نصیب ہوگی۔

(۰)

ہماری نئی نسل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں مذہب کے خلاف جو بغاوت اُبھر رہی ہے اس کے متعلق آپ کو ہر محراب و منبر سے یہ آواز مسلسل سنائی دے گی کہ یہ سب اس مغربی تعلیم کا نتیجہ ہے جس کا بیج سرسید نے بویا ——— انہیں کون بتائے کہ یہ سرسید کی تعلیم کا نتیجہ نہیں۔ یہ نتیجہ ہے اس مذہبی تعلیم کا جس کی رُو سے آپ انہیں بتاتے ہیں کہ بابا آدم کی پسلی چیر کر اس میں سے ان کی بیوی نکالی گئی تھی۔ وہ اس مذہب سے متنفر نہ ہوں گے تو کیا اُسے گلے سے لگائیں گے؟.... سرسید کی تعلیم نے جس قسم کے مسلمان پیدا کیے تھے اس کی ایک مثال، ہفت روزہ "صدق" (لکھنؤ) کے مرحوم مدیر مولانا عبدالماجد دریابادی کی زبان سے سنیئے۔ انہوں نے لکھا تھا:۔

> غالباً ۱۸۹۸ء کا ذکر ہے۔ سرسید کی وفات یا تو ہو چکی تھی یا عنقریب ہونے کو تھی۔ علی گڑھ کی شہرت کرکٹ کے میدان میں ہندوستان گیر ہو چکی تھی کہ ایک کرکٹ میچ، سول سروس والوں کے مقابلہ میں نینی تال میں قرار پایا۔ میچ شروع ہوا اور اتفاق کہ جمعہ کا دن تھا۔ سول سروس ٹیم کھیل رہی تھی اور علی گڑھ کھلا رہی تھی۔ علی گڑھ کے شہرۂ آفاق باؤلر اشفاق باؤلنگ کر رہے تھے۔ ایک مرتبہ جو اشفاق نے گیند پھینکنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو یکایک نماز جمعہ کی اذان کی آواز کان میں آئی۔ معاً بلا توقف اس کا اٹھا ہوا ہاتھ، نیچے گر گیا۔ اشفاق نے اتنا بھی نہ کیا کہ باؤلنگ پوری کر لیتا۔ سول سروس والے اس پابندیٔ احکام پر عش عش کر اُٹھے۔ (طلوع اسلام۔ جون ۱۹۶۵ء صفحہ ۲۴)

یہ تھے "نیچری" سرسید کی درسگاہ کے تعلیم و تربیت یافتہ نوجوان! فرمایئے؛ سرسید کے خلاف طعن و تشنیع کے تیر برسانے والے ہزار ہاتھ، اشفاق کے اس گرنے والے ہاتھ پر نچھاور کیے جا سکتے ہیں یا نہیں؟

(۰)

سرسید نے علومِ جدیدہ کی تحصیل کی جو اہمیت قوم کے سامنے پیش کی تھی، اس کا تصور تو آہستہ آہستہ

پھیل رہا تھا لیکن اقوامِ مغرب کے لئے وہ کسی خاص خطرہ کا موجب نہیں تھا۔ اب جو مسلمانوں کے مختلف ممالک آزاد ہوئے اور زمانے کے تقاضوں نے ان پر علومِ جدیدہ، بالخصوص سائنٹیفک علوم کی تحصیل کی اہمیت کو شدت سے واضح کیا، تو اس سے ان اقوام کو خطرہ محسوس ہوا، اور انہوں نے سر جوڑ کر اس کے سدِباب کی تدابیر کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ گہری سوچ اور بچار کے بعد، وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمان مذہب پرست قوم ہے۔ اگر ان میں اس احساس کو شدید کر دیا جائے کہ اصلی اسلام وہی ہے جو ان کے عہدِ ملوکیت میں وضع ہوا اور جو صدیوں سے متواتر چلا آ رہا ہے۔ اور جدت پسندیاں الحاد اور بے دینی کی طرف لے جاتی ہیں، تو یہ خطرہ ٹل سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ان کی اس سکیم کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔ چنانچہ ارمغانِ حجاز میں ان کی نہایت اہم نظم ——— ابلیس کی مجلسِ شوریٰ ——— اقوامِ مغرب کی اسی سکیم کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ میں نے اس سے پہلے بھی کئی بار اس حقیقت کو واضح کیا ہے لیکن آجکل اس نے جو خصوصی اہمیت اختیار کر رکھی ہے اس کے پیشِ نظر اس کا دُہرانا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس نظم میں کہا گیا ہے کہ جب ابلیس کے مشیروں نے اس کی توجہ اس خطرہ کی طرف مبذول کی تو اس نے کہا کہ:۔

جانتا ہوں میں یہ اُمّت حاملِ قرآں نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف — ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!

اس پر انہوں نے پوچھا کہ اس خطرہ کے سدِباب کے لئے ہمیں کرنا کیا چاہیئے، تو اس نے کہا کہ اس کے لئے پروگرام یہ ہے کہ:۔

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات؟

اس کے لئے کرنا یہ چاہیئے کہ اسے اس قسم کے مسائل میں اُلجھائے رکھو کہ:۔

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے! — ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جُدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے — یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریمؑ کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم — اُمّتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں — یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے! — تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

اور آخر میں اس نے کہا کہ:۔

ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمّت کی بیداری سے میں — ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ:۔

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے!

اقبالؒ نے یہ کچھ ۱۹۳۶-۳۷ء میں کہا تھا۔ اور اقوامِ مغرب اسی وقت سے اس پروگرام کی پخت و پز میں لگ گئی تھیں۔ میرے پاس وقت نہیں ورنہ میں بتاتا کہ اس تمام دوران میں یہ اقوام کس کس رنگ میں اس پروگرام کو نہایت خاموشی سے اور غیر محسوس طور پر آگے بڑھاتی رہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے، پروگرام یہ تھا کہ مسلمانوں کے دل میں اس فریب کو راسخ کر دیا جائے کہ حقیقی اسلام وہی ہے جو مذہب کے نام سے ان کے ہاں مروج چلا آرہا ہے۔ دین کی طرف دعوت، جو قرآن مجید میں محفوظ ہے، بدعت ہے۔ الحاد ہے۔ بے دینی ہے۔ ان کی یہ سکیم محو خرام تو ایک عرصہ سے تھی لیکن گذشتہ دو تین سالوں سے یہ عالم گیر حیثیت اختیار کر رہی ہے۔ یہ اس لئے کہ مسلم ممالک بالخصوص پاکستان میں، اسلامی نظام قائم..... کرنے کا خیال ابھرا تو انہیں خدشہ پیدا ہوا کہ اگر نظام علامہ اقبالؒ کے تصور کے مطابق قائم ہو گیا تو ان کا سیاسی اور معاشی نظام تباہ ہو جائے گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مسلم اقوام کو اس طرف آنے ہی نہ دیا جائے اور انہیں اس نظامِ کہن کی بھول بھلیوں میں الجھا دیا جائے جو فلاح و بہبود کی راہ ان کے سامنے کشادہ ہی نہ ہونے دے۔ اس سے پہلے اقوامِ مغرب، مسلمان مذہب پرستوں کو قدامت پرست (CONSERVATISTS) اور جہالت پسند (OBSCURANTIST) کہا کرتی تھیں۔ ان القابات میں نفرت اور حقارت پائی جاتی تھی اس لئے انہوں نے اپنے جدید پروگرام کے لئے نام بھی جدید تجویز کیا۔ یعنی (FUNDAMENTALISM) اور اس کے داعیوں کو (FUNDAMENTALISTS) کہہ کر پکارنے لگے۔ ان اصطلاحات کے لئے ابھی تک اردو میں کوئی موزوں اصطلاح تراشی نہیں گئی۔ اس تحریک کو انہوں نے اس قدر پھیلایا ہے کہ قریب قریب ہر مسلمان ملک میں اس کی شاخیں قائم ہیں اور وہاں کے نامور پیشوایانِ مذہب اور قدامت پسند پیشہ ور اس کے ساتھ منسلک ہیں۔ مغرب اپنی تحریکوں کو پھیلانے کے لئے اخراجات کی طرف نہیں دیکھا کرتا اس لئے یہ حضرات دولت لوٹ بھی رہے ہیں اور لٹ بھی رہے..... یہ حضرات بڑے فخر سے اپنے آپ کو فنڈامینٹل ایسٹ کہتے ہیں۔ کیونکہ مولوی کا لفظ ان کے نزدیک دقیانوسی سا ہو گیا ہے اور فنڈامینٹل ایسٹ میں جدت پائی جاتی ہے۔ جن اقوام نے یہ اختراع وضع کی ہے ان کے ہاں اس کا مفہوم کیا ہے یہ ہم سے نہیں، انہی سے پوچھئے۔ پچھلے دنوں امریکہ کے ایک پروفیسر (DR. BRUCE B. LAURENCE) پاکستان آئے ہوئے تھے۔ یہ صاحب، ڈیوک یونیورسٹی، ڈرھم میں ریلیجن کے پروفیسر اور مغربی اور اسلامی مطالعاتی پروگرام کے مشیر ہیں۔ ان کا ایک انٹرویو، کراچی کے روزنامہ ڈان کی ۱۱ جون کی اشاعت میں شائع ہوا تھا جس کے دوران ان سے پوچھا گیا کہ ان کے نزدیک فنڈامینٹل ازم کا مفہوم کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ

> اس تحریک کے ساتھ وابستگان کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ یہ غیر مسلموں ہی کی نہیں، خود اپنے مسلمان بھائیوں کی بھی کسی بات کو برداشت نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا کہ فنڈامینٹل ایسٹ وہ ہے جو اس بات پر مصر ہوتا ہے کہ صرف اس کا نقطۂ نظر اور مسلک

صحیح ہے اور باقی سب گمراہ ہیں۔ وہ مصر کے اخوان المسلمین ہوں یا ایران کے مجاہدین، ان کا طرزِ عمل متصلب (بے لچک) ہوتا ہے اور کسی دوسرے کی بات ماننے کی ان کے ہاں گنجائش ہی نہیں ہوتی ہے۔

قرآن مجید اپنے ہر دعوے کو دلائل کی رُو سے پیش کرتا اور مخالفین سے بھی کہتا ہے کہ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ۔ تم بھی اپنے دعویٰ کی تائید میں دلیل پیش کرو۔ لیکن جہالت اپنے دعویٰ کو تعصب کی بنا پر پیش کرتی، اور دھاندلی سے منواتی ہے۔

اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو، فنڈامینٹل ازم کی مبہم اصطلاح کا فریب دے کر، پھر سے ادوارِ متوسطہ (AGES MEDIEVAL) کی طرف لوٹا دیا جائے اور اس اسلام کا احیاء کیا جائے جو ان کے عہدِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا۔ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

آپ اس پر غور کیجئے کہ اسلام کے نام سے جو قوانین پاکستان میں مرتب ہو رہے ہیں، ان کی بنیاد وہی فقہ اور روایات ہیں جو عباسیوں کے عہدِ ملوکیت میں وضع ہوئیں تھیں۔

پاکستان میں قانون سازی

پہلے یہاں حدود (سزاؤں) سے متعلق قوانین نافذ کئے گئے جو اُسی فقہ پر مبنی تھے۔ ان کے نفاذ کے چند ہی دن بعد کچھ امریکی صحافی صدرِ پاکستان سے ملنے کے لئے آئے تو انہوں نے کہا کہ جو اسلامی قوانین آپ نے نافذ کئے ہیں وہ تو تاریخ کے عہدِ بربریت کی یاد تازہ کراتے ہیں۔ صاحبِ صدر نے جواب میں کہا کہ ان کے ساتھ ایسی شرائط وابستہ ہیں جن کی رُو سے نہ وہ قوانین نافذ ہوں گے، نہ کسی کو یہ سزائیں مل سکیں گی۔ آپ غور فرمائیے کہ اس سے دنیا اسلام کے متعلق کیا تصوّر قائم کرے گی؟ پھر یہاں زکوٰۃ کے متعلق قانون نافذ کیا گیا جس کے خلاف احتجاج ہوا تو فیصلہ کیا گیا کہ ہر فرقہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق خود ہی زکوٰۃ ادا کر دیا کرے۔ وہ اس قانون سے مستثنیٰ ہیں البتہ جو لوگ اپنے آپ کو قرآن کا پابند قرار دیں گے وہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہوں گے۔ رجم (سنگساری) کے خلاف وفاقی شرعی عدالت نے پہلے یہ فیصلہ دیا کہ یہ سزا اسلام کے خلاف ہے۔ اس کی تدوین نو کر کے، اسے اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی کرنے کے لئے کہا گیا تو اس نے فیصلہ صادر فرما دیا کہ یہ سزا عین اسلام کے مطابق ہے۔ یعنی چند ہی دنوں کے عرصہ میں، ایک ہی عدالت کی طرف سے اسلام کے متعلق دو متضاد فیصلے صادر ہو گئے۔ دیگر کئی ایک قوانین بھی زیرِ ترتیب ہیں جن کے متعلق قسم قسم کی باتیں سننے میں آتی ہیں لیکن چونکہ انہوں نے ہنوز قانونی شکل اختیار نہیں کی اس لئے ان کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔

اس تحریک نے کئی نئے نئے فقیہہ، مفتی اور مجدد پیدا کر دیئے ہیں جن کے پاس اگرچہ قدامت پرست علماء حضرات جتنا علم بھی نہیں لیکن وہ از خود مسندِ افتاء پہ بیٹھے، آئے دن اس قسم کے فتاویٰ نافذ کرتے رہتے ہیں کہ فلاں بات بھی اسلام کے خلاف ہے اور فلاں بات بھی.... اس کے لئے وہ کسی اتھارٹی کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ان کا ارشاد ہی کسی بات کے اسلامی یا غیر اسلامی قرار دینے کے لئے کافی اتھارٹی ہے۔ معیار یا لبداہت یہ ہے کہ جو چیز بھی قرآن مجید اور علم و بصیرت کے مطابق ہو، وہ غیر اسلامی ہے۔ عورتوں کو گھر کی چار دیواری کے اندر نظر بند رکھنا چاہیئے۔ اگر انہیں کسی اشد ضرورت کے لئے گھر سے باہر نکلنا ہو تو اس طرح لپٹے لپٹائے نکلیں کہ ان کی صرف ایک آنکھ دکھائی دے۔ ان کا کسی ایسی جگہ کام کرنا جہاں مرد بھی موجود ہوں خلافِ شریعت ہے۔ مردوں اور عورتوں کی مساوات کا تصوّر غیر اسلامی اور مغرب سے مستعار لیا ہوا ہے۔ عورتیں پارلیمان کی ممبر نہیں بن سکتیں انہیں یہاں ووٹ کا حق بھی نہیں دینا چاہیئے۔ فوٹو اتروانا خلافِ شریعت ہے۔ (لیکن ٹی۔ وی پر آنا جائز ہے کیونکہ یہ حضرات خود ٹی۔ وی پر آتے اور کثیر معاوضہ پاتے ہیں) چونکہ یہ لوگ (AESTHETIC SENSE) یعنی فنونِ لطیفہ سے محظوظ ہونے کی حسِ لطیف سے محروم ہوتے ہیں، اس لئے ان کے نزدیک یہ فنون سب ناجائز ہیں۔ حتیٰ کہ قوالی بھی۔ صرف ڈھول اور دف (ڈفلی) کی اجازت ہے۔

یہ ہیں چند مثالیں اس اسلام کی جسے یہ فنڈامینٹل اسٹ رائج کرنا چاہتے ہیں۔ مقصد اس سے (دو لفظوں میں) یہ کہ یُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ ..... (۶۱/۸) تاکہ جو روشنی خدا نے (اپنی کتاب میں) انسانوں کو عطا کی تھی اسے پھونکیں مار مار کر بجھا دیا جائے۔ سرسید کے یہ سب سے بڑے دشمن ہیں۔

اسلام کے سیاسی نظام کے متعلق ہنوز کچھ فیصلہ نہیں ہوا لیکن ابھی سے اس قسم کی آوازیں ابھرنی شروع ہو گئی ہیں کہ شخصی حکومت، ڈکٹیٹرشپ، ملوکیت، حتیٰ کہ موروثی حکومت بھی عین مطابقِ اسلام ہے اور اس کی سند یہ ہے کہ، صدرِ اوّل کے مختصر سے عرصہ کے بعد، ہمارے ہاں ملوکیت (بلکہ موروثی ملوکیت) متواتر چلی آ رہی ہے۔ آپ نے اس ستم ظریفی پر بھی کبھی غور فرمایا ہے کہ ایک طرف یزید کے خلاف سب سے بڑا جرم یہ عائد کیا جاتا ہے کہ اس نے حکومت ورثہ میں حاصل کر کے ملوکیت کی طرح ڈالی تھی اور اس طرح اسلام کی جڑ کاٹ کر رکھ دی تھی۔ اور دوسری طرف ان تمام مسلمان بادشاہوں کو جنہوں نے اسی طرح مملکت حاصل کی تھی، صحیح اسلامی حکمران ثابت کیا جا رہا ہے۔ اور آج جبکہ زمانے کے تقاضے ہر قسم کی شخصی حکومت کو مٹانے کے درپے ہیں، مسلمانوں میں اس کے احیاء کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اقوامِ مغرب کو مسلمانوں کی شخصی حکومتیں زیادہ (SUIT)

کرتی ہیں اور دوسری یہ کہ ہمارے ہاں انہی قوانین کو اسلامی کہہ کر نافذ کیا جا رہا ہے، جو ان سلاطین کے عہد میں مدوّن ہوئے تھے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان سلاطین کو اسلامی حکمران قرار دیا جائے تاکہ ان کے عہد میں وضع شدہ قوانین کے اسلامی ہونے کی سند ہاتھ آ جائے۔ ظاہر ہے کہ فنڈامینٹل ازم سب سے زیادہ مخالفت اس کی کریگی جو قرآن کی طرف دعوت دیتا ہو۔ اس لئے کہ قرآن، ہر قسم کی شخصی حکومت کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ شخصی حکومت کی ہی نہیں بلکہ مغرب کی سیکولر جمہوریت کی بھی۔ اس لئے کہ اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ.... کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق ہی حاصل نہیں۔ خواہ وہ ایک فرد ہو اور خواہ افراد کا کوئی گروہ۔ حکومت صرف خدا کی جائز ہے جس کا عملی طریق، اس کی کتاب (قرآن مجید) کی حکمرانی ہے۔ اسی کو ابدی اقدار کی حکمرانی کہا جاتا ہے۔ یہ نکتہ ذرا وضاحت طلب ہے۔ قرآن میں ہے کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ..... (۹۷/۱) "ہم نے اسے لیلۃ القدر میں نازل کیا۔ لیل کے معنی رات کے ہیں لیکن اس سے مراد وہ تاریک دور بھی ہو سکتا ہے جس کے بعد سحرِ قرآنی کی نمود ہوئی اور دنیا کو روشنی عطا ہوئی۔

مستقل اقدار

دوسرا لفظ قدر ہے جس کے معنی ہیں پیمانہ۔ یعنی قرآن نے نوعِ انسانی کو حق و باطل کے ماپنے کے صحیح صحیح پیمانے عطا فرمائے۔ انہی کو مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہتے ہیں اور یہی درحقیقت دین اور لادینی۔ کفر اور اسلام۔ اسلامی نظام اور سیکولرازم میں حدِ امتیاز ہے۔ اسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

زندگی جب ارتقائی منازل طے کرتی آگے بڑھتی ہے تو ہر اگلی منزل میں، اپنی پچھلی منزل کے کچھ مضمرات ساتھ لے آتی ہے۔ جب یہ وادیٔ حیوانیت سے منزلِ انسانیت میں داخل ہوئی تو حیوانی زندگی کے کچھ تقاضے اپنے ساتھ لے آئی۔ انہیں جبلی تقاضے یا (INSTINCTS) کہا جاتا ہے۔ ان میں دو تقاضے بڑے اہم ہیں ـــــ یعنی تحفظِ خویش ـــــ اور افزائشِ نسل (یعنی جنسی تقاضا)۔ یہ تقاضے حیوانوں اور انسانوں میں مشترک ہیں لیکن ایک بڑے اہم فرق کے ساتھ۔ حیوانات پر فطرت اپنا کنٹرول رکھتی ہے اور انہیں ان کی حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ شیر گوشت کھاتا ہے۔ سبزی اس کے لئے حرام ہے۔ بکری سبزی کھاتی ہے، گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتی خواہ بھوکوں کیوں نہ مر جائے۔ یا (مثلاً) ایک بیل کے سامنے کتنا ہی چارہ کیوں نہ رکھا ہو۔ جب اس کا پیٹ بھر جائے گا تو وہ اطمینان سے ایک طرف بیٹھ کر جگالی کرنے لگ جائے گا۔ باقی چارے کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھے گا۔ جہاں تک جنسی تقاضا کا تعلق ہے۔ فطرت نے اس پر بڑے سخت (VALVE) لگا رکھے ہیں۔ حیوانی نر اور مادہ سارا سال اکٹھے چرتے چگتے رہیں گے۔ ایک دوسرے کی طرف "نظرِ بد" سے دیکھیں گے بھی نہیں۔ لیکن جب اختلاط کا موسم (MATING SEASON) آئے گا تو بھیڑ،

افزائشِ نسل کا فریضہ سرانجام دیں گے اور اس کے بعد، اگلے موسم تک پھر وہی سکوت اور سکون۔ فطرت نے حیوانات کے ان تقاضوں پر اس طرح ویٹو لگا رکھے ہیں۔

انسان میں بھی یہ تقاضے موجود ہیں لیکن اسے خدا نے صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے اس لئے ان تقاضوں کے پورا کرنے پر، اس پر فطرت کی طرف سے کوئی کنٹرول عائد نہیں کیا گیا۔ اب آپ سوچئے کہ حیوانات کے مقابلے میں انسان کو لامحدود وسعتیں اور بے پناہ قوتیں دی گئی ہوں، اور اس پر خارج سے کوئی کنٹرول عائد نہ کیا گیا ہو۔ تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ باہمی تصادمات اور تزاحمات کا وہی جہنم جس میں انسان شروع سے جھلستا چلا آرہا ہے اور جس کے شعلے آج فلک گیر ہو رہے ہیں کیونکہ اس کی امکانی وسعتیں حدود فراموش ہو رہی ہیں۔ انسان کا سارا مسئلہ یہ ہے کہ ان تقاضوں کے پورا کرنے پر کنٹرول کو نسا اور کس طرح عائد کیا جائے کہ انسانوں میں باہمی ٹکراؤ پیدا نہ ہو۔ انسانی فکر نے، سقراط سے لے کر آج تک اس باب میں ہزاروں تراکیب سوچیں اور طریقے وضع کئے لیکن ان میں سے کوئی بھی کامیاب ثابت نہ ہوا۔ وحیٔ خداوندی نے کہا کہ جس خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے وہی حدود مقرر کر سکتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے ان تقاضوں کو پورا کیا جائے تو کسی قسم کا ٹکراؤ پیدا نہیں ہو سکتا۔ ان حدود کا دوسرا نام اقدار ہے۔ جو قرآن کے اندر آکر مکمل ہو گئی ہیں اور غیر متبدل ہیں۔ انہی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام اسلام ہے اور جس معاشرہ میں یہ اقدار عملاً کارفرما ہوں اسے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ اقدار ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ کسی انسان کو، ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل یا حک و اضافہ کرنے کا اختیار نہیں۔ یہ اقدار ان حدود کا کام دیتی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانے کی اُمّتِ مسلمہ باہمی مشاورت سے جملہ امورِ مملکت طے کرتی ہے۔ ان ... اقدار کے مطابق جو معاشرہ قائم ہوتا ہے اس میں نہ انسانوں کی کسی قسم کی حکومت بار پا سکتی ہے، نہ ہی نظامِ سرمایہ داری یا مذہبی پیشوائیت۔ غیر مسلم طاقتیں اسی لئے اس نظام کی مخالفت کرتی چلی آرہی ہیں۔ اس کا طریق انہوں نے یہ اختیار کر رکھا ہے کہ چند نظری مسائل اور فقہی احکام کا نام اسلام رکھ دیا جائے اور اُمّت کو ان مباحث میں اُلجھا دیا جائے۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے ان اقوام کو سب سے زیادہ خطرہ پاکستان سے تھا کیونکہ اسی سرزمین میں سرسیدؒ اور اقبالؒ کی روشن کردہ قرآنی قندیلیں درخشندہ ہیں اور انہیں ڈر ہے کہ یہاں وہ نظام قائم نہ ہو جائے۔ اس لئے فنڈامینٹلزم کی یلغار کا نمایاں رخ اسی خطہ کی طرف ہے۔ لیکن یہ وقتی اور ہنگامی جھکڑ ہیں جو تیرہ سو سال سے چلتے آرہے ہیں۔ یہ قرآنی شمع کو (خدانخواستہ) گل نہیں کر سکتے، اس لئے کہ خدا کا وعدہ اور اعلان ہے کہ

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (۹/۳۳)

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطہ راہ نمائی اور حق پر مبنی دین (نظام) دے کر بھیجا۔

اس نظام کو دنیا کے ہر نظام پر غالب آکر رہنا ہے۔ خواہ یہ بات ان لوگوں کو کتنی ہی گراں کیوں نہ گذرے جو خدا کے ساتھ انسانوں کو بھی حقِ حکومت دیتے ہیں۔

جس خدا نے نزولِ قرآن کی ابتداء "افراد کی رات" میں کی تھی اس نے وہیں کہہ دیا تھا کہ اس کی روشنی پھیلے گی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ سَلٰمٌ (۹۷/۵) کائنات کے ہر گوشے اور زندگی کے ہر شعبے سے سلامتی کی آوازیں وجہِ فردوسِ گوش ہوں گی۔ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۹۷/۵) تاآنکہ رات کی تاریکیاں چھٹ کر ساری فضا صبح کی نورانیت سے معمور ہو جائے گی۔ یہ نورانیت سب سے پہلے عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہٗ میں وجہ تابانیِ عالم ہوئی تھی جس سے زندگی کے تاریک سے تاریک تر گوشے بھی چمک اٹھے تھے۔ وہ انقلاب ہنگامی طور پر (BY REVOLUTION) ظہور میں آیا تھا۔ اس کے بعد یہ انقلاب ارتقائی طور پر (BY EVOLUTION) رونما ہوگا جب انسان اپنے غلط تجارب کے ہلاکت آفریں نتائج سے تنگ آکر، قرآن کے بتائے ہوئے راستے کی طرف آئے گا۔ آپ یہ معلوم کر کے متعجب ہوں گے کہ جن قوموں کے سیاسی اور معاشی تقاضے مسلمانوں کو فنڈامینٹل ازم جیسی تاریکیوں کی طرف لے جانے کی سازشیں کر رہے ہیں، انہی اقوام کے اربابِ دانش قرآنی نظام کی تلاش میں مضطرب و سرگرداں ہیں۔ لہٰذا، قرآنی نظام کا قیام تو لوعِ انسان کا مقدر ہے۔ اقبالؒ نے بہت پہلے کہا تھا کہ: ؎

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش   اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار   نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

ظاہر ہے کہ اس سحر کی نمود اس قوم میں ہوگی جو قرآنی حقائق کو علم و بصیرت کی رو سے سمجھنے کی کوشش کرے گی۔ اور جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں اقدارِ خداوندی کے مطابق استعمال میں لائے گی۔ ان میں پہلی قدر یہ ہے کہ کوئی انسان رات کو بھوکا نہ سوئے اور دوسری قدر یہ کہ کسی انسان کی کسی طور بھی تذلیل نہ ہو۔

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں، این است و بس

(۰)

طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک

(جسے معلوماتِ عامہ کے لئے وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا ہے۔)

(۱) تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اسے اپنے رہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

(۲) خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے ابد تک ضابطۂ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آ سکتا ہے۔ قرآنِ کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتمآب خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

(۳) قرآنِ کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابعِ تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

(۴) نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمتِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصّہ جو قرآن سے باہر ہے۔ سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضورؐ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی اصول صحابۂ کبارؓ کی سیرتِ مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہیئے۔

(۵) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظامِ مملکت کی رو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظامِ زندگی کا نام ہے) ممکن نہیں ہو سکتا۔

(۶) رسول اللہؐ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآنِ کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے تمام امورِ مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

(۷) رسول اللہؐ کے بعد دین کا وہی نظام حضورؐ کے خلفائے راشدین نے جاری رکھا۔ اس میں امورِ مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآنِ کریم نے

صرف اصول دیئے ہیں ان کی بجا آوری کے اندر اُمت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے لئے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔

(۸) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے اُمت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور، دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن اب مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

(۹) ہمارے لئے کام کرنے کا یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو اُمت کو احکام و قوانینِ خداوندی کے مطابق چلائے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانینِ خداوندی کے تابع ہو گی۔

(۱۰) چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہو گا۔ اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہو گا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کیلئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہم گڈمڈ ہو جائیں گے۔

(۱۱) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا، اُمت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز، روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردّ و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اُسے "خدا اور رسول" کا طریقہ قرار دے۔

(۱۲) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی، روٹی، کپڑا، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

(۱۳) قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

(۱۴) جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآنِ کریم کے مطابق ہو، یا جس سے حضور نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

(۱۵) ہم، رسول اللہؐ کے بعد، ہر قسم کے مدعیٔ وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

(۱۶) طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہلِ قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)۔ نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ اُمت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز، روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں، ہم ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کرتے۔ اور بلا ردّ و بدل ان کی پابندی کرتے ہیں۔ ہم قرآنِ کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔ یہ ہے ہمارا مسلک، جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔ اس کے خلاف جو کچھ ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ مخالفین کا گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے۔